رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۳۰

جلد ۶۱ عدد ۱

اکتوبر ۱۹۶۳ء

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

مقابل ذیلدار پارک اچھرہ لاہور (پاکستان)

سالانہ چندہ ۶ روپے

قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۶۱	اکتوبر ۱۹۶۳ء	عدد ۱

مطبوعات ع۔ ح

ابوالخیر مودودی، پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ

لاہور سے شائع کیا

ضروری اعلان

ایک مدت سے ترجمان القرآن کی اشاعت مسلسل تاخیر کے ساتھ ہوتی رہی ہے جس پر ناظرین کے ساتھ میں بھی بڑی تشویش محسوس کر رہا تھا۔ اب پوری کوشش کر کے ہم رسالے کی اشاعت کو وقت پر لے آتے ہیں اور اللہ کے فضل سے توقع ہے کہ آئندہ یہ پرچہ ہر انگریزی مہینے کی پہلی سے ۵ تاریخ تک شائع ہو جائے گا۔

ترجمان کی طباعت بھی اس وقت تک کچھ زیادہ قابلِ اطمینان نہیں رہی ہے۔ اب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ نومبر ۶۳ء سے یہ پرچہ آفسٹ پر طبع ہوگا، اور اس کی ضخامت میں بھی ۸ صفحات کا اضافہ کر دیا جائے گا۔

اس نئے انتظام کی وجہ سے مصارف میں جو اضافہ ہوگا اس کو پورا کرنے کے لیے ہم سالانہ قیمت میں ایک روپے کا، اور فی پرچہ قیمت میں دو آنے کا اضافہ کر رہے ہیں۔ اب تمام خریداروں کو سالانہ ۷ روپے اور متفرق خریداروں کو ایک پرچے کے لیے ۷۵ نئے پیسے یا ۱۲ آنے ادا کرنے ہوں گے۔

مجھے امید ہے کہ ترجمان القرآن کے خریدار اس اضافے کو بخوشی قبول فرمائیں گے۔

ابوالاعلیٰ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

ایک ایک اور دو گیارہ، اگرچہ سادہ سا محاورہ ہے لیکن ایک نہایت اہم نفسیاتی حقیقت کا شارح اور ترجمان ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب دو انسان باہم مل کر اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو کسی کام پر لگاتے ہیں تو اس اتفاق و اتحاد کی وجہ سے وہ دو آدمیوں کی قوت نہیں رہتی بلکہ گیارہ آدمیوں کی قوت بن جاتی ہے جس طرح آلہ مکبر الصوت ہلکی پھلکی آواز میں قوت و توانائی پیدا کر کے اسے دور دراز گوشوں تک نشر کرتا ہے بالکل اسی طرح اجتماعی جدوجہد انفرادی کوششوں کے اندر غیر معمولی طاقت پیدا کر کے انہیں حیرت انگیز حد تک مؤثر بنا دیتی ہے۔

اتفاق و اتحاد بجائے خود طاقت کا سرچشمہ ہے لیکن جب یہ اتحاد کسی نیک اور پاکیزہ مقصد کے لیے قائم کیا جاتا ہے تو اس میں "غیر معمولی برکت" پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ "برکت" کچھ یونہی محض بخت و اتفاق سے معرض وجود میں نہیں آتی بلکہ یہ بعض ٹھوس اسباب کا بالکل فطری ثمرہ ہوتی ہے۔ جب چند انسان ایک قافلے کی صورت میں کسی اعلیٰ اور ارفع مقصد کی طرف بڑھتے ہیں تو اس کے نتیجے میں ایک ایسا ماحول تیار ہو جاتا ہے جو افراد کے دلوں میں اس مقصد کے لیے غیر معمولی محبت پیدا کر دیتا ہے۔ اس ماحول میں ہر سانس کے ساتھ اس ماحول کے حیات آفریں اثرات خود بخود آدمی کے قلب و دماغ کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے اندر جو قوت و توانائی آتی ہے اس میں اسی صحت مند ماحول کے عناصر شامل ہوتے ہیں، وہ جب اپنے گردوپیش پر نگاہ ڈالتا ہے تو اس کی نظروں کے سامنے اسی ماحول کے حسین اور دلکش مناظر آتے ہیں۔ الغرض اس کی زندگی کا

کوئی گوشہ اور اس کے قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا نہیں ہوتا جس پر اس کے گہرے اثرات مترتب نہ ہوں۔ اور یہی چیز اس کے اندر مقصد کی بے پناہ لگن اور اس کے حصول کے لیے غیر متزلزل عزم اور ارادہ پیدا کرتی ہے۔

پھر اجتماعی جدوجہد کی قوت کا راز اس بات میں بھی مضمر ہے کہ افراد کی خداداد صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت الگ الگ صلاحیتیں دی ہیں۔ کسی شخص کو قسامِ ازل سے حیرت انگیز قوتِ گویائی ملتی ہے اور وہ اس کے سحر سے لوگوں کو مسحور کر لیتا ہے، کسی کو قلم کی طاقت عطا ہوتی ہے۔ اور وہ اس کی مدد سے افکار و جذبات کی دنیا میں ایک تلاطم برپا کر دیتا ہے۔ کسی کو بے پناہ تنظیمی صلاحیت سے نوازا جاتا ہے اور وہ منتشر افراد کو ایک مرکز پر جمع کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ کسی کے اندر غیر معمولی جرأت اور بے باکی ہوتی ہے اور وہ جباروں اور قہاروں کے پندار کو ختم کر کے رکھ دیتا ہے۔ بعض لوگوں کو رحیم و کریم ذات قلبی سوز و گداز روحانی لطافت و طہارت سے سرفراز فرماتی ہے اور وہ اس دولت کے ذریعہ لوگوں کے تزکیۂ نفس کا سامان کرتے ہیں ؂

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونقِ چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

انسانی صلاحیتوں کے یہ رنگا رنگ مظاہر اپنی جگہ پر خواہ کتنے دلکش ہوں لیکن اُس وقت تک اپنی اصلی بہار نہیں دکھا سکتے جب تک کہ یہ باہم مل کر کسی گلستان کی زینت کا سامان نہ بن جائیں۔ چمن کی سازگار فضا ہی ان کے نکھار کے لیے صحیح اور مناسب مواقع فراہم کر سکتی ہے۔ مثلاً اگر ایک شخص کو اللہ تعالیٰ نے بیان کی قدرت عطا کی ہے تو اس کی صحیح تربیت کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے اندر رُوحانی سوز بھی پیدا ہو تاکہ اُس کے کلام سے دلوں کی انگیٹھیاں گرمی اور حرارت حاصل

کریں۔ اسی طرح اگر کسی فرد میں جرأت و بے باکی بدرجۂ اتم موجود ہے لیکن اُس کی زندگی توازن اور اعتدال سے خالی ہے تو وہ انسانیت کے لیے کسی طرح بھی فائدہ مند نہیں ہو سکتا۔ انسانیت کی فلاح اسی وقت ممکن ہے جب جوش و ہوش ایک دوسرے کے ہمعناں اور قوت و جبروت اور فقر و انکسار ایک دوسرے کے ہمرکاب رہیں۔ اور یہ مقصد صرف اجتماعی زندگی میں ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

اجتماعی جدوجہد نہ صرف مختلف صلاحیتوں کو ایک مقام پر مرتکز کرنے کا مؤثر ذریعہ ہے بلکہ اس کی مدد سے بسا اوقات کمزوروں اور ناتوانوں کے اندر فکر و عمل کی غیر معمولی قوتیں ابھر آتی ہیں فطرت نے اپنے عطیات کی تقسیم میں کسی فرد کے ساتھ ناانصافی سے کام نہیں لیا۔ ہر انسان کو اُن میں سے مناسب اور معقول حصہ ملا ہے۔ مگر ماحول کی ناسازگاری، اور حالات کی نامساعدت کی وجہ سے یہ صلاحیتیں صحیح انداز پر پرورش نہیں پا سکتیں اور ٹھٹھر کر رہ جاتی ہیں۔ حیات اجتماعی ان خفتہ بلکہ افسردہ قوتوں کو زندگی کی حرارت اور ولولہ بخشتی ہے اور پھر انہیں صحیح اور مناسب کام پہ لگاتی ہے۔

اس کے علاوہ چند انسان جب یک جان ہو کر اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو کسی بلند و برتر مقصد میں کھپانے کا فیصلہ کرتے ہیں تو اُن کے اندر بعض ایسی ارفع و اعلیٰ صفات پیدا ہو جاتی ہیں جو انسانیت کا بیش قیمت اثاثہ اور سرمایۂ حیات ہیں۔ ان میں سب سے پہلی صفت جذبۂ ایثار ہے۔ ایثار کے بغیر کسی ہیئت اجتماعی کا تصور نہیں کیا جا سکتا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ایثار ہی وہ زادِ راہ ہے جس کے بل بوتے پر انسانوں کا کوئی قافلہ کسی خاص نصب العین کی طرف بڑھتا ہے تو یہ زیادہ صحیح ہو گا۔ اس پُونجی کے بغیر ایک قدم بھی کامیابی کے ساتھ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اجتماعی زندگی افراد سے زر و مال کی قربانی، اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کی قربانی اور جذبات و احساسات کی قربانی کا تقاضا کرتی ہے۔ انسان اپنے افکار و نظریات میں، اپنے میلانات اور رجحانات میں، ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہیں کہ جب تک کسر و انکسار سے کام لیکر اپنے تصورات و احساسات کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ

نہ کرلیں یا کم از کم کسی تصور کی محبت میں سرشار ہو کر وہ معمولی اختلافات کو برداشت کرنے پر آمادہ نہ ہو جائیں اس وقت تک کسی کامیاب اجتماعی زندگی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

نقطۂ نظر کے اختلاف میں رواداری اور وسعتِ قلبی، یہ وہ بنیادیں ہیں جن پر حیاتِ اجتماعی کی رفیع الشان عمارت اٹھائی جاتی ہے۔ آپ خود ہی غور کریں کہ ہمارے سوچنے اور سمجھنے کے انداز، ہمارے اطوار اور ہماری عادات ایک دوسرے سے کتنی مختلف ہیں لیکن اس کے باوجود ہم سب ایک ہی معاشرے سے وابستہ ہیں۔ سوسائٹی کے ان مائل بہ انتشار اجزا کو آخر کس چیز نے ایک دوسرے سے پیوستہ کر رکھا ہے۔ اس مسئلہ پر آپ جس قدر سوچ بچار کریں گے آپ کو معلوم ہو گا کہ رواداری ہی وہ اصل مقناطیسی قوت ہے جو ان مختلف اجزا کو جوڑے ہوتے ہے۔ اگر ہم میں سے ہر شخص یہ طے کر لے کہ اُس کے پسندیدہ نظریات کا ہی معاشرہ میں سکہ چلے گا، اس کا ذوق ہی اس کا قانون ہو گا، اُس کے رجحانات کے مطابق عام لوگوں کے رجحانات ڈھالے جائیں گے اور اس معاملے میں کسی شخص کو کوئی رعایت نہ دی جائے گی تو اجتماعی زندگی کا شیرازہ بہت جلد منتشر ہو کر رہ جائیگا۔

اجتماعی زندگی کے قیام کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ جہاں ہم دوسرے کے افکار و تصورات پر اثر انداز ہو کر ان کے اندر مناسب تبدیلیاں پیدا کرنے کی کوشش کریں وہاں ہم خود اپنے تخیلات کا جائزہ لیکر اُن کے اندر بھی بعض ایسی ترامیم کرنے پر آمادہ ہو جائیں جن سے کسی معاشرے کا اجتماعی تخیل متصادم نہ ہونے پاتے۔ یہ ابن الوقتی اور منافقت نہیں بلکہ ایثار اور رواداری ہے جس کے بغیر حیاتِ اجتماعی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جس کو اپنائے بغیر سوسائٹی کی تنظیم ناممکن ہے۔ یہ انسان کے ظرف اور اس کے ذوقِ تناسب کی بدیہی شہادت ہے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ انسان معاشرہ کے مجموعی مفاد کی خاطر اپنے ذوق تک کی قربانی دینے کے لیے تیار ہے۔

ہماری ان گذارشات سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم اصولوں کے معاملے میں کسی مداہنت کے قائل ہیں۔ ہم اس قسم کی "رواداری" یا وسعتِ قلبی سے جس سے اصولوں پر زد پڑتی ہو، خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔ ہم البتہ جس چیز کے قائل ہیں اور جسے ہم اجتماعی زندگی کی تشکیل کے لیے ضروری سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہمارے اصول جہاں تک ہمیں اجازت دیں اُس حد تک ہمیں دوسرے کے نقطۂ نظر کو برداشت کرنے کی اپنے اندر ہمت پیدا کرنی چاہیے۔ اصولوں کے اندر بھی کسی قدر وسعت ہوتی ہے اور ان کے دامن میں جتنے افکار و نظریات اور جتنے تصورات و میلانات سمیٹے جا سکیں انہیں سمیٹنے میں ہمیں بخل اور تنگ نظری سے کام نہ لینا چاہیے۔

آپ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے اختلافات کا اگر گہرائی میں اُتر کر مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جن مسائل کو ان فرقوں کے رہنما بنیادی مسائل سمجھ کر ایک دوسرے کے درپے آزار ہیں، وہ کسی لحاظ سے بھی "اساسی نظریات" کے زمرے میں نہیں آتے۔ اُن کی حیثیت فروعات کی سی ہوتی ہے جن کے بارے میں متعدد آراء ممکن ہیں۔ لیکن ہم اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے انہیں بنیادی اور اساسی معتقدات تسلیم کروانے پر مُصر ہیں۔

اصول و فروع کے درمیان فطری امتیاز کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے ہماری حیاتِ اجتماعی میں سخت انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ ہماری زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو اپنی اصلی حالت پر قائم ہو۔ کسی صحت مند اجتماعی نظم کے لیے یہ چیز انتہائی ضروری ہے کہ اُس کے اندر اقدارِ حیات کے مابین اُسی تناسب کو برقرار رکھا جائے جس کا کہ وہ نظام مقتضی ہے۔ اگر اقدار کی فطری ترتیب کو درہم برہم کر کے اپنے ذوق اور رجحان کے مطابق اُن کے درمیان کوئی نئی ترتیب قائم کی جائے گی تو اس سے سارے نظام میں بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔ ہمارے ہاں آج فکر و نظر کی جو کجی اور جذبہ و احساس کے اندر جو عدمِ توازن دکھائی دیتا ہے وہ اقدارِ حیات کے اسی اختلال کا

فطری نتیجہ ہے۔

آپ نے بارہا اس چیز کو محسوس کیا ہوگا کہ ملّتِ اسلامیہ کی عظیم اکثریت اسلام سے الہانہ لگاؤ رکھتی ہے۔اس کی عزت کے لیے ہر قسم کی قربانی کرنے پر تیار رہتی ہے۔لیکن ان مقدس احساسات اور جذبات کے ہوتے ہوئے بھی اس کی بگڑی نہیں بنتی۔اس کی وجہ ہمارے نزدیک صرف ایک ہی ہے کہ اس کی بیشتر صلاحیتیں اور قوتیں اُن کاموں میں ضائع ہورہی ہیں جو اسلام میں یا تو سرے سے مقصود ہی نہیں ہیں، یا اگر کسی حد تک مطلوب ہیں تو اُن کی حیثیت بالکل ثانوی ہے۔ اسلام میں جن امور کو اولیت کا شرف حاصل ہے انہیں اگر اپنے اصل مقام سے ہٹا کر کچھ دوسری چیزوں کو اپنے رجحان کے مطابق اس بلند و بالا منصب پر فائز کیا جائے گا تو اس سے پورا نظام تہ و بالا ہو جائے گا اور ہمارا اخلاص ہمارا جذبۂ ایثار، ہماری اسلام سے غیر معمولی محبت اور وابستگی دین کے لیے کچھ زیادہ مفید اور کارآمد ثابت نہ ہوگی۔دین کی سربلندی کے لیے جہاں حسنِ نیت اور حسنِ عمل لازمی شرائط ہیں وہاں فکر و نظر میں صحت اور جذبہ و احساس میں توازن بھی ضروری ہے۔اگر فکر و نظر کے زاویے صحیح اور درست نہ ہوں تو پھر اقدارِ حیات کی ترتیب میں بنیادی طور پر سُقم رہ جاتا ہے اور اس سقم کی موجودگی میں کوئی کوشش بھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوسکتی۔

ہم یہ بات کسی فخر و مباہات کی بنا پر نہیں بلکہ محض تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی نے اسلامی اقدارِ حیات کی ترتیب کو درست کرنے میں خداوند تعالیٰ کے فضل سے بہت بڑی خدمت سرانجام دی ہے۔یہ اس کی حقیر کوششوں کا ثمرہ ہے کہ مسلم سوسائٹی کے مختلف طبقوں کے درمیان اختلاف کی جو وسیع خلیج حائل تھی وہ آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے اور مختلف گروہ اور فرقے دینِ حق کے نفاذ کے ارفع و اعلیٰ مقصد کے پیشِ نظر ایک دوسرے کی طرف دستِ تعاون بڑھا رہے

ہیں۔ آپ کو اگر جماعت کی اس خدمت کا اندازہ لگانا مقصود ہو تو براہ کرم اس کے سالانہ اجتماع میں جو اسی سال ۲۵ سے ۲۸ اکتوبر کو لاہور میں منعقد ہو رہا ہے تشریف لائیے اور دیکھیے کہ اصول فروع کے درمیان کس قدر صحت مندانہ توازن برقرار رکھا ہے اور اس وجہ سے ان کے مابین اخوت و محبت کے کتنے مضبوط رشتے استوار ہوتے ہیں۔ یہاں آپ کو جدید تعلیم یافتہ طبقے اور قدیم طرز کے علماء کے درمیان کوئی بُعد اور بیگانگی محسوس نہ ہو گی بلکہ دونوں کے درمیان یک جہتی اور اتحاد دکھائی دےگا۔ مختلف فقہی مسالک سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان کسی قسم کی کوئی تلخی اور رنجش محسوس نہ ہو گی بلکہ ان کے سینوں میں ایک دوسرے کے لیے خیر سگالی اور محبت کے جذبات موجزن نظر آئیں گے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ فروعی مسائل میں دست و گریباں ہونے کی بجائے اصول اور کلیات کی خاطر ایک دوسرے کے دلسوز، فدائی اور دمساز رفیق بننے کے لیے بیتاب ہوں گے۔

میری ان گزارشات کا یہ مقصد نہیں کہ جماعت اسلامی "من و تو" کے سارے جھگڑے ختم کر دینے کا ارادہ رکھتی ہے۔ انسانوں کے درمیان اختلافات کا ہونا بالکل فطری ہے۔ ہمارے سوچنے اور سمجھنے کے انداز، ہمارے احساسات و جذبات میں قدرتی طور پر اختلافات پائے جاتے ہیں اس لیے انہیں یکسر مٹانا ایک ناممکن العمل سی بات ہے۔ جماعت اسلامی اس قسم کے غیر فطری پروگرام میں اپنی قوتیں صرف کرنا کسی طرح بھی سود مند نہیں سمجھتی۔ وہ اس ضمن میں جو کچھ کرنے کا عزم رکھتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اسلام کے بنیادی اصولوں پر ان تمام لوگوں کو جمع کر دیا جائے جو دل میں دین کا کچھ درد رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ انہیں ان اختلافات کو برداشت کرنے اور ان کے معاملے میں رواداری برتنے کی تربیت دی جائے جن کی اسلام میں کوئی گنجائش موجود ہے۔ یہ ہے وہ طریق جس کے ذریعہ امت کے مختلف طبقات کے درمیان جماعت اسلامی نے اتحاد پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔

جس طرح کسی شخص کی تندرستی کا صحیح اندازہ کسی وقتی اور عارضی تکلیف سے نہیں بلکہ اس کے

عام معیارِ صحت سے کیا جاتا ہے بالکل اسی طرح کسی معاشرے کی اخلاقی حالت کا فیصلہ اِکا دکا واقعات سے نہیں بلکہ عام رجحانات سے کیا جا سکتا ہے۔

اس معروف اصول کو سامنے رکھ کر جب ہم پاکستان کی مسلم سوسائٹی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں سخت تشویش لاحق ہوتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کو آبرو باختہ بنانے کا تہیہ کر لیا گیا ہے۔ ایک طرف اُن ساری قوتوں کو اُبھارا جا رہا ہے جن کی وجہ سے لوگوں کے اندر فکری انتشار پیدا ہو اور اُن کے ایمان متزلزل ہوں اور دوسری طرف فسق و فجور کو جو اسلام کی عین ضد ہے معاشرے کے رگ و پے میں ایک لگے بندھے منصوبے کے تحت اتارنے کی مختلف تدبیریں ہو رہی ہیں۔

اس ملک کا مغرب زدہ طبقہ جس کے ہاتھ میں اس وقت قوم کی سربراہی کا منصب بھی ہے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے کہ ایمان اور اخلاق کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر کوئی قوت مسلمانوں سے اُن کا اخلاق سلب کرنے میں کامیاب ہو جائے تو پھر ایمان کا خود بخود جنازہ نکل جائے گا اور اسے غارت کرنے میں اُسے کوئی الگ جدوجہد نہ کرنا پڑے گی۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ اُس نے کبھی بھی کسی بد اخلاق فرد قوم یا گروہ کو دین کی خدمت کا مقدس فرض نہیں سونپا۔ اُس نے اس کے لیے غریبوں اور ناداروں کو، غلاموں اور بے کسوں کو، کمزوروں اور ناتوانوں کو تو منتخب کیا ہے لیکن فساق و فجار کو کبھی یہ موقع فراہم نہیں کیا کہ وہ دین کی حفاظت اور پاسبانی کا فریضہ ادا کریں۔

ہمارے ہاں اخلاق کو جو دین کے لیے ایک بنیادی شرط ہے جس طرح برباد کیا جا رہا ہے اُس کے اندازے کے لیے کسی گہری تحقیق کی ضرورت نہیں۔ صرف اخبارات پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالیے یا اپنے گرد و پیش کا سرسری سا جائزہ لیجیے تو آپ کو دھارے کا رُخ بڑی آسانی سے معلوم ہو سکے گا ہم یہاں صرف دو واقعات نقل کرتے ہیں جن سے صورتِ حال کی سنگینی کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے
جماعت اسلامی کے مرکز کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد میں سرگودھا کے ایک معروف عالم خطبہ

جمعہ میں حضور سرورِ کائنات کی حیاتِ طیبہ کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کر رہے تھے کہ اچانک ایک سپاہی نمودار ہوا اور اس نے کہا کہ یہاں لاؤڈ اسپیکر استعمال کرنے کی اجازت نہیں۔ فاضل مقرر نے اُس کے حکم کے مطابق اس کے بغیر ہی تقریر کو جاری رکھا۔ لیکن چند منٹوں کے بعد پھر ایک سنتری آدھمکا اور اُس نے مولانا کو تقریر کرنے سے روک دیا۔ اس ضمن میں یہ ذہن نشین رہے کہ اس تقریر کا "سیاست سے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا۔

پھر اسی مسجد کے امام جو ایک درویش صفت بزرگ ہیں انہیں تھانے میں بلا کر اُن کی تذلیل کی گئی۔ اُن بیچاروں کا جُرم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ فجر کی نماز کے بعد لاؤڈ اسپیکر پر درسِ قرآن مجید دیا کرتے تھے۔ انہوں نے ہر طرح عذر خواہی کرنا چاہی لیکن ایک نہ سنی گئی اور اس وقت تک رہائی نہ ملی جب تک کہ محلّے کے معززین نے تھانیدار کو اس بات کی ضمانت نہ دے دی کہ وہ آئندہ درسِ قرآن کے لیے لاؤڈ اسپیکر استعمال نہیں کریں گے۔

اسی قسم کا انسانیت سوز سلوک پاکستان کے ایک مشہور عالم کے ساتھ رحمان پورہ (لاہور) کی جامع مسجد میں کیا گیا۔ وہ خطبۂ جمعہ ارشاد فرما رہے تھے کہ انہیں لاؤڈ اسپیکر کے بند کرنے کے احکام جاری کیے گئے۔

ہماری عقل یہ باور نہیں کر سکتی کہ اس قسم کے عاقبت نا اندیشانہ اقدام کوئی تھانیدار اپنی ذمہ داری پر کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ یہ "عالمِ بالا" کے اشاروں کی تعمیل معلوم ہوتی ہے۔ پھر اس معاملہ کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ اس قسم کے احمقانہ احکام کو جس انداز سے نافذ کیا جاتا ہے وہ انتہائی شرمناک ہے۔ اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس ملک کا نوکر شاہی طبقہ مسلمانوں کے احساسات و جذبات سے بالکل ناآشنا ہے اور وہ انہیں مجروح کرنے اور صدمہ پہنچانے میں راحت محسوس کرتا ہے۔

گل برگ (لاہور) کے صنعتی ایریا کی مسجد کا انہدام اس کی تازہ ترین مثال ہے۔ مسلمانوں کا شاید ہی کوئی طبقہ ایسا ہوگا جس نے اصحابِ اختیار کو اس ناپاک عزم کی تکمیل سے باز رہنے کی تلقین نہ

کی ہو لیکن عوام کا شدید احتجاج بالکل بے اثر ثابت ہُوا اور بالآخر یہ مسجد پیوندِ خاک کر دی گئی۔ یہ اتنا بڑا سانحہ آخر کیوں پیش آیا؟ اس کی وجہ ہمارے نزدیک ایک ہی ہے کہ اس ملک کا برسرِ اقتدار طبقہ مساجد کی عظمت سے قطعاً ناواقف ہے۔ اگر اس کے دل میں اس کا کچھ بھی احساس ہوتا تو وہ کبھی اس ظالمانہ فعل کی جرأت نہ کرتا۔ کیا اس مسجد کے برقرار رہنے کی وجہ سے پاکستان پر آسمان گرنے کا خطرہ تھا جو اس کے مسمار ہو جانے کی وجہ سے ٹل گیا ہے۔

عین انہیں ایام میں جبکہ اسلامی معابد اور اُن کے خادموں کے ساتھ یہ شرمناک سلوک کیا جا رہا تھا، عوام کی نظروں سے یہ خبر بھی گزری ہو گی کہ میکلوڈ روڈ جیسی معروف شاہراہ کے ایک ہوٹل میں نیم عُریاں ناچ کا انتظام کیا گیا ہے۔ یُوں تو اس وقت اسی شہر کے کئی ایک ہوٹلوں میں "ڈنر ڈانس" کے پروگرام ہوتے ہیں اور اخبارات میں اشتہارات کے ذریعہ لوگوں کو "دعوتِ نظارہ" دی جاتی ہے لیکن زیرِ بحث ہوٹل کا معاملہ اس پہلو سے خصوصیت کا حامل ہے کہ جہاں دوسرے ہوٹلوں کے دروازے صرف انتہائی امیر لوگوں کے لیے کھلے ہیں جن کی عظیم اکثریت رقص و سرود کی پہلے ہی سے رسیا ہے وہاں اس ہوٹل کے ذریعہ اوسط اور ادنیٰ طبقہ کے نوجوانوں بالخصوص طلبہ کے اخلاق برباد کرنے کا سامان کیا گیا ہے۔ اور اس خبر کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جن غیرتمند لوگوں نے اس شرمناک صورتِ حال کو دیکھ کر اس کے راستے میں حائل ہونے کی کوشش کی ہے انہیں ڈرا دھمکا کر اس راہ سے ہٹانے کا انتظام کیا گیا ہے۔

ناچ فسق و فجور کا سرچشمہ ہے۔ اس لیے اسے کسی ایسی مملکت میں برداشت نہیں کیا جا سکتا جو اسلامی نظامِ حیات کے قیام کی دعویدار ہو۔ اسے ہماری بدنصیبی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس ملک کے سربراہوں نے اسلام کے متعلق ہمیشہ بڑے بلند بانگ دعوے کیے ہیں لیکن ان دعووں کے عملی تقاضوں کو کبھی بھی پُورا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ یہاں فسق و فجور پوری قوت کے ساتھ پھیلتا رہا۔ چونکہ سوسائٹی کا عام طبقہ اسے پسند نہ کرتا تھا اس لیے عام

لوگوں میں یہ سرعت کے ساتھ راہ نہ پا سکا۔ اس کی اخلاق سوز سرگرمیاں زیادہ تر اونچے طبقوں تک محدود رہیں۔ لیکن اب عوام بھی ان کی لپیٹ میں آنے لگے ہیں۔ چنانچہ دیکھیے فحاشی اور بے حیائی کے جو اخلاق سوز مناظر بڑے بڑے ہوٹلوں میں دکھائے جاتے تھے اب انہیں معمولی ہوٹلوں میں بھی دکھانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو روگ صرف اونچے طبقے کو لگا ہوا ہے اُس سے اب سوسائٹی کے عام طبقے بھی محفوظ نہ رہ سکیں گے۔

یہ چند واقعات جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے یہ استثنائی مثالیں نہیں بلکہ یہ وہ عام واقعات ہیں جن سے ہمیں ہر دَور میں سابقہ پیش آتا ہے اور ہمارے نزدیک یہی چیز سب سے زیادہ پریشان کن ہے۔ ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اب حالات کا دھارا نہایت خطرناک سمت کی طرف بہہ نکلا ہے اور اگر اس کا رُخ موڑنے کی کوشش نہ کی گئی تو پھر اس امت کو کوئی چیز بھی تباہی و بربادی سے بچا نہ سکے گی۔ جس مسلم سوسائٹی میں درسِ قرآن، خطباتِ جمعہ اور مساجد کے ساتھ یہ انسانیت سوز سلوک کیا جاتے اور ان کے مقابلے میں فسق و فجور کو پھیلانے کے باقاعدہ منصوبے تیار کیے جائیں اور خود حکومت پورے شعور اور احساس ذمہ داری کے ساتھ ان منصوبوں کی تکمیل کا انتظام کرے اُسے آخر عذابِ الٰہی سے کون سی چیز بچا سکتی ہے۔

حکومتِ پاکستان نے پریس پر تازہ پابندیوں کا آرڈیننس نافذ کر کے جس آمرانہ ذہنیت کا ثبوت دیا ہے، اُس سے پورا ملک تلملا اٹھا ہے۔ اس آرڈیننس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی پاکستان نے جن خدشات کا اظہار فرمایا ہے وہ گہرے غور و فکر کے محتاج ہیں اور امت کے تمام سوچنے سمجھنے والے افراد کو دعوتِ فکر دیتے ہیں انہوں نے ان آرڈیننسوں کی شدید مذمت کرتے ہوئے اربابِ حکومت کو خبردار کیا ہے کہ اگر ان میں کچھ بھی سوجھ بوجھ باقی ہے اور وہ ملک کے اور خود اپنے دشمن نہیں ہو گئے ہیں تو پیشتر اس کے کہ ملک کا وقار دنیا کی نگاہوں میں بالکل ہی

ختم ہو کر رہ جاتے اور قوم کے اندر مایوسی و بددلی اپنی آخری حد کو پہنچ جاتے وہ اس طرح کی کارروائی کا سلسلہ جلد بند کر دیں۔ اسی سلسلہ میں مولانا نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے:

"پریس کی آزادی سلب کرنا ایک ڈکٹیٹر شپ کے قیام کی ہمیشہ تمہید ہوا کرتا ہے۔ کوئی ڈکٹیٹر شپ ایک آزاد پریس کے ساتھ نہیں چلا کرتی۔ اس لیے جب کبھی حکمرانوں کو من مانی کرنی ہو اور اپنے کرتوتوں کے بے نقاب ہونے سے وہ بچنا چاہیں تو اُس کے لیے پریس کی آزادی کے اوپر پابندیاں عائد کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ یہ تازہ آرڈیننس درحقیقت اسی ذہنیت کا غماز ہے۔

اس آرڈی ننس میں اسمبلیوں اور عدالتوں کی کارروائیوں کی اشاعت پر جو پابندیاں عائد کی گئی ہیں ان کو اور ان کے تاریخی پس منظر کو دیکھ کر صاف محسوس ہوتا ہے کہ پچھلے دنوں بعض عدالتی کارروائیوں میں اور اسمبلی کے اجلاسوں میں برسرِ اقتدار طبقے کے لوگ جس بُری طرح بے نقاب ہوتے ہیں اس سے وہ بوکھلا گئے ہیں اب وہ چاہتے ہیں کہ اپنے کارناموں پر پردہ ڈالنے کا انتظام کریں۔ آرڈی ننسوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام کارروائیاں عملاً بند کمروں کی کارروائیاں بن کر رہ جائیں گی۔ اسمبلیوں کی کارروائیوں کے بھی "کاشف احوال" پہلو اسمبلی چیمبر تک محدود ہو کر رہ جائیں گے اور اس طرح پبلک کو بے خبر رکھ کر برسرِ اقتدار طبقے کے لوگ زیادہ آسانی سے جمہوریت کے حدود کو توڑ سکیں گے۔ اب ہر شخص یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ اس کے بعد عدالتوں میں مقدمات چلانے اور اسمبلیوں میں بحث کرنے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ دنیا بھر میں یہ بات مسلّم ہے کہ جب تک عدالتوں میں برسرِ عام سماعت نہ ہو، انصاف کی امید نہیں کی جا سکتی، اور برسرِ عام سماعت کے معنی یہ ہیں کہ عدالتی کارروائیاں جیسی کہ وہ ہوں، پریس میں آجائیں۔ اسی طرح اسمبلیوں کے بننے کا کوئی حاصل نہیں ہے اگر پبلک کو معلوم نہ ہو کہ اسمبلی میں کیا حقائق سامنے آرہے ہیں اور کس کا کیا کردار ہے۔ جب تک پبلک ان چیزوں سے واقف نہ ہو، انتخابات کے موقع پر وہ کیسے رائے قائم کر سکتی ہے کہ کون اس کے اعتماد کا مستحق ہے اور کون نہیں۔ ہمارے حکمران اگر اپنی قوم کو اس قابل نہیں ہونے دینا چاہتے تو پھر خواہ مخواہ جمہوریت کا ڈھونگ رچانے کی آخر کیا ضرورت ہے۔"

تفہیم القرآن

ص

(۳)

اور داؤد کو ہم نے سلیمان (جیسا بیٹا) عطا کیا،[۳۲] بہترین بندہ، کثرت سے اپنے رب کی طرف رجوع کرنے والا۔ قابلِ ذکر ہے وہ موقع جب شام کے وقت اس کے سامنے خوب سدھے ہوئے تیز رو گھوڑے پیش کیے گئے[۳۳] تو اس نے کہا "میں نے اس مال[۳۴] کی محبت اپنے رب کی یاد کی وجہ سے اختیار کی ہے"۔ یہاں تک کہ جب وہ گھوڑے نگاہ سے اوجھل ہو گئے تو (اس نے حکم دیا کہ) انہیں میرے پاس واپس لاؤ، پھر لگا ان کی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے۔[۳۵] اور (دیکھو کہ) سلیمان کو بھی ہم نے آزمائش میں ڈالا اور اس کی کرسی پر ایک

---

[۳۲] حضرت سلیمان کا ذکر اس سے پہلے حسب ذیل مقامات پر گزر چکا ہے: تفہیم القرآن جلد اول، ص ۹۷۔ جلد دوم، ص ۵۹۷ - ۵۹۸ - جلد سوم ص ۱۷۳ تا ۱۷۸ - ۵۶۰ تا ۵۸۲ - سورۂ سبا، آیات ۱۲-۱۴۔

[۳۳] اصل الفاظ ہیں اَلصّٰفِنٰتُ الْجِیَادُ۔ اس سے مراد ایسے گھوڑے ہیں جو کھڑے ہوں تو نہایت سکون کے ساتھ کھڑے رہیں، کوئی اچھل کود نہ کریں، اور جب دوڑیں تو نہایت تیز دوڑیں۔

[۳۴] اصل میں لفظ خَیر استعمال ہوا ہے جو عربی زبان میں مالِ کثیر کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اور گھوڑوں کے لیے بھی مجازاً استعمال کیا جاتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان گھوڑوں کو چونکہ راہِ خدا میں جہاد کے لیے رکھا تھا، اس لیے انہوں نے "خیر" کے لفظ سے ان کو تعبیر فرمایا۔

[۳۵] ان آیات کے ترجمہ اور تفسیر میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

ایک گروہ ان کا مطلب یہ بیان کرتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام گھوڑوں کے معائنے اور ان کی

دوڑ کے ملاحظہ میں اس قدر مشغول ہوئے کہ نمازِ عصر بھول گئے، یا بقول بعض اپنا کوئی خاص وظیفہ پڑھنا بھول گئے جو وہ عصر و مغرب کے درمیان پڑھا کرتے تھے، یہاں تک کہ سورج چھپ گیا۔ تب انہوں نے حکم دیا کہ ان گھوڑوں کو واپس لاؤ، اور جب وہ واپس آئے تو حضرت سلیمانؑ نے تلوار لے کر ان کو کاٹنا، یا بالفاظِ دیگر، اللہ کے لیے اُن کو قربان کرنا شروع کر دیا کیونکہ وہ ذکرِ الٰہی سے غفلت کے موجب بن گئے تھے۔ اس مطلب کے لحاظ سے ان آیات کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے: "تو اس نے کہا، مَیں نے اس مال کی محبت کو ایسا پسند کیا کہ اپنے رب کی یاد (نمازِ عصر، یا وظیفۂ خاص) سے غافل ہو گیا، یہاں تک کہ (سورج پردۂ مغرب میں) چھپ گیا۔ (پھر اس نے حکم دیا کہ) واپس لاؤ ان (گھوڑوں) کو (اور جب وہ واپس آ گئے) تو لگا اُن کی پنڈلیوں اور گردنوں پر (تلوار کے) ہاتھ چلانے۔" یہ تفسیر اگرچہ بعض اکابر مفسرین نے کی ہے، لیکن یہ اس وجہ سے قابلِ ترجیح نہیں ہے کہ اس میں مفسر کو تین باتیں اپنی طرف سے بڑھانی پڑتی ہیں جن کا کوئی ماخذ نہیں ہے۔ اولاً وہ فرض کرتا ہے کہ حضرت سلیمان کی نمازِ عصر اس شغل میں چھوٹ گئی، یا ان کا کوئی خاص وظیفہ چھوٹ گیا جو وہ اس وقت پڑھا کرتے تھے۔ حالانکہ قرآن کے الفاظ صرف یہ ہیں، اِنِّیْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَیْرِ عَنْ ذِکْرِ رَبِّیْ۔ ان الفاظ کا ترجمہ یہ تو کیا جا سکتا ہے کہ "میں نے اس مال کی محبت کو اتنا پسند کیا کہ اپنے رب کی یاد سے غافل ہو گیا" لیکن ان میں نمازِ عصر یا کوئی خاص وظیفہ مراد لینے کے لیے کوئی قرینہ نہیں ہے۔ ثانیاً وہ یہ بھی فرض کرتا ہے کہ سورج چھپ گیا، حالانکہ وہاں سورج کا کوئی ذکر نہیں ہے، بلکہ حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ کے الفاظ پڑھ کر آدمی کا ذہن بلا تامل اَلصّٰفِنٰتُ الْجِیَادُ کی طرف پھرتا ہے جن کا ذکر پچھلی آیت میں ہو چکا ہے۔ ثالثاً وہ یہ بھی فرض کرتا ہے کہ حضرت سلیمان نے گھوڑوں کی پنڈلیوں اور گردنوں پر خالی مسح نہیں کیا بلکہ تلوار سے مسح کیا، حالانکہ قرآن میں مَسْحًا بِالسَّیْفِ کے الفاظ نہیں ہیں، اور کوئی قرینہ بھی ایسا موجود نہیں جس کی بنا پر مسح سے مسح بالسیف مراد لیا جا سکے۔ ہمیں اس طریقِ تفسیر سے اصولی اختلاف ہے۔ ہمارے نزدیک قرآن کے الفاظ سے زائد کوئی مطلب لینا چار ہی صورتوں میں درست ہو سکتا ہے۔ یا تو قرآن ہی کی عبارت میں اس کے لیے کوئی قرینہ موجود ہو، یا قرآن میں کسی دوسرے مقام پر اس کی طرف کوئی اشارہ ہو، یا کسی صحیح حدیث

میں اس اجمال کی شرح ملتی ہو، یا اس کا اور کوئی قابلِ اعتبار ماخذ ہو۔ مثلاً تاریخ کا معاملہ ہے تو تاریخ میں اس اجمال کی تفصیلات ملتی ہوں، آثارِ کائنات کا ذکر ہے تو مستند علمی تحقیقات سے اس کی تشریح ہو رہی ہو، اور احکامِ شرعیہ کا معاملہ ہے تو فقہ اسلامی کے ماخذ اس کی وضاحت کر رہے ہوں۔ جہاں ان میں سے کوئی چیز بھی نہ ہو وہاں محض بطور خود ایک قصہ تصنیف کر کے قرآن کی عبارت میں شامل کر دینا ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔

ایک اور گروہ نے مذکورۂ بالا ترجمہ و تفسیر سے تھوڑا سا اختلاف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ اور رُدُّوْھَا عَلَیَّ، دونوں کی ضمیر سورج ہی کی طرف پھرتی ہے۔ یعنی جب نماز عصر فوت ہو گئی اور سورج پردۂ مغرب میں چھپ گیا تو حضرت سلیمانؑ نے کارکنانِ قضا و قدر سے کہا کہ پھیر لاؤ سورج کو تاکہ عصر کا وقت پھر آ جائے اور میں نماز ادا کر لوں، چنانچہ سورج واپس آیا اور انہوں نے نماز پڑھ لی۔ لیکن یہ تفسیر اوپر والی تفسیر سے بھی زیادہ ناقابلِ قبول ہے۔ اس لیے نہیں کہ اللہ تعالیٰ سورج کو واپس لانے پر قادر نہیں ہے، بلکہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا قطعاً کوئی ذکر نہیں فرمایا ہے، حالانکہ حضرت سلیمانؑ کے لیے اتنا بڑا معجزہ صادر ہوا ہوتا تو وہ ضرور قابلِ ذکر ہونا چاہیے تھا۔ اور اس لیے بھی کہ سورج کا غروب ہو کر پلٹ آنا ایسا غیر معمولی واقعہ ہے کہ اگر وہ درحقیقت پیش آیا ہوتا تو دنیا کی تاریخ اس کے ذکر سے ہرگز خالی نہ رہتی۔ پھر اس تفسیر کی تائید میں یہ حضرات بعض احادیث پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ سورج کا غروب ہو کر دوبارہ پلٹ آنا ایک ہی دفعہ کا واقعہ نہیں ہے بلکہ قصۂ معراج میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے سورج کے واپس لائے جانے کا ذکر ہے، غزوۂ خندق کے موقع پر بھی حضورؐ کے لیے وہ واپس لایا گیا، اور حضرت علیؓ کے لیے بھی، جبکہ حضورؐ ان کی گود میں سر رکھے سو رہے تھے اور ان کی نماز عصر قضا ہو گئی تھی۔ حضورؐ نے سورج کی واپسی کی دعا فرمائی تھی اور وہ پلٹ آیا تھا۔ لیکن ان روایات سے استدلال اس تفسیر سے بھی زیادہ کمزور ہے جس کی تائید کے لیے انہیں پیش کیا گیا ہے۔ حضرت علیؓ کے متعلق جو روایت بیان کی جاتی ہے، اس کے تمام طُرُق اور رجال پر تفصیلی بحث کر کے ابن تیمیہؒ

نے اسے موضوع ثابت کیا ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے اور ابن جوزی کہتے ہیں کہ وہ بلا شک و شبہ موضوع ہے۔ غزوۂ خندق کے موقع پر سورج کی واپسی والی روایت بھی بعض محدثین کے نزدیک ضعیف اور بعض کے نزدیک موضوع ہے۔ رہی قصۂ معراج والی روایت، تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کفار مکہ سے شبِ معراج کے حالات بیان فرما رہے تھے تو کفار نے آپ سے ثبوت طلب کیا۔ آپ نے فرمایا کہ بیت المقدس کے راستے میں فلاں مقام پر ایک قافلہ ملا تھا جس کے ساتھ فلاں واقعہ پیش آیا تھا۔ کفار نے پوچھا وہ قافلہ کس روز مکہ پہنچے گا۔ آپ نے فرمایا فلاں روز۔ جب وہ دن آیا تو قریش کے لوگ دن بھر قافلہ کا انتظار کرتے رہے یہاں تک کہ شام ہونے کو آگئی۔ اس موقع پر حضورؐ نے دعا کی کہ دن اس وقت تک غروب نہ ہو جب تک قافلہ نہ آجائے۔ چنانچہ فی الواقع سورج ڈوبنے سے پہلے وہ پہنچ گیا۔ اس واقعہ کو بعض راویوں نے اس طرح بیان کیا ہے کہ اُس روز دن میں ایک گھنٹہ کا اضافہ کر دیا گیا اور سورج اتنی دیر تک ٹھیرا رہا۔ سوال یہ ہے کہ اس قسم کی روایات کیا اتنے بڑے غیر معمولی واقعہ کے ثبوت میں کافی شہادت ہیں؟ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، سورج کا پلٹ آنا، یا گھنٹہ بھر رکا رہنا کوئی معمولی واقعہ تو نہیں ہے۔ ایسا واقعہ اگر فی الواقع پیش آگیا ہوتا تو دنیا بھر میں اس کی دھوم مچ گئی ہوتی۔ بعض اخبار آحاد تک اس کا ذکر کیسے محدود رہ سکتا تھا؟

مفسرین کا تیسرا گروہ ان آیات کا وہی مفہوم لیتا ہے جو ایک خالی الذہن آدمی اس کے الفاظ پڑھ کر اس سے سمجھ سکتا ہے۔ اس تفسیر کے مطابق واقعہ بس اس قدر ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے جب اعلیٰ درجے کے اصیل گھوڑوں کا ایک دستہ پیش کیا گیا تو انہوں نے فرمایا، یہ مال مجھے کچھ اپنی بڑائی کی غرض سے یا اپنے نفس کی خاطر محبوب نہیں ہے بلکہ ان چیزوں سے دلچسپی کو میں اپنے رب کا کلمہ بلند کرنے کے لیے پسند کرتا ہوں۔ پھر انہوں نے ان گھوڑوں کی دوڑ کرائی یہاں تک کہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے ان کو واپس طلب فرمایا اور جب وہ آئے تو بقول ابن عباس، جعل یمسح اعراف الخیل وعراقیبھا حبًّا لہا "حضرت ان کی گردنوں پر اور

جسد لا کر ڈال دیا۔ پھر اس نے رجوع کیا اور کہا کہ "اے میرے رب، مجھے معاف کر دے اور مجھے وہ بادشاہی دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو، بیشک تو ہی اصل داتا ہے"۔ تب ہم نے اس کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا جو اس کے حکم سے ان کی پنڈلیوں پر محبت سے ہاتھ پھیرنے لگے"۔ یہی تفسیر ہمارے نزدیک صحیح ہے، کیونکہ یہ قرآن مجید کے الفاظ سے پوری مطابقت رکھتی ہے اور مطلب کی تکمیل کے لیے اس میں ایسی کوئی بات بڑھانی نہیں پڑتی جو نہ قرآن میں ہو، نہ کسی صحیح حدیث میں اور نہ بنی اسرائیل کی تاریخ میں۔

یہ بات بھی اس موقع پر نگاہ میں رہنی چاہیے کہ اس واقعہ کا ذکر اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان کے حق میں نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ (بہترین بندہ، اپنے رب کی طرف کثرت سے رجوع کرنے والا) کے تعریفی کلمات ارشاد فرمانے کے معًا بعد کیا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مقصود دراصل یہ بتانا ہے کہ دیکھو، وہ ہمارا ایسا اچھا بندہ تھا، بادشاہی کا سر و سامان اس کو دنیا کی خاطر نہیں بلکہ ہماری خاطر پسند تھا، اپنے شاندار رسالے کو دیکھ کر دنیا پرست فرمانرواؤں کی طرح اس نے ڈینگیں نہ ماریں بلکہ اس وقت بھی ہم ہی اسے یاد آتے

۳۶؎ سلسلۂ کلام کے لحاظ سے اس جگہ اصل مقصد یہی واقعہ بیان کرنا ہے اور پچھلی آیات اسی کے لیے بطور تمہید ارشاد ہوئی ہیں۔ جس طرح پہلے حضرت داؤد کی تعریف کی گئی، پھر اس واقعہ کا ذکر کیا گیا جس میں وہ مبتلائے فتنہ ہو گئے تھے، پھر بتایا گیا کہ اللہ جل شانہٗ نے اپنے ایسے محبوب بندے کو بھی محاسبہ کیے بغیر نہ چھوڑا، پھر ان کی یہ شان دکھائی گئی کہ فتنے پر متنبہ ہوتے ہی وہ تائب ہو گئے اور اللہ کے آگے جھک کر انہوں نے اپنے اس فعل سے رجوع کر لیا، اسی طرح یہاں بھی ترتیبِ کلام یہ ہے کہ پہلے حضرت سلیمان علیہ السلام کے مرتبۂ بلند اور شانِ بندگی کا ذکر کیا گیا ہے، پھر بتایا گیا ہے کہ ان کو بھی آزمائش میں ڈالا گیا، پھر ان کی یہ شانِ بندگی دکھائی گئی ہے کہ جب ان کی کرسی پر ایک جسد لا کر ڈال دیا گیا تو وہ فوراً ہی اپنی لغزش پر متنبہ ہو گئے اور اپنے رب سے معافی مانگ کر انہوں نے اپنی اس بات سے رجوع کر لیا جس کی وجہ سے وہ فتنے میں پڑے تھے۔ بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ ان دونوں قصوں سے بیک وقت

دو باتیں ذہن نشین کرانا چاہتا ہے - ایک یہ کہ اس کے بے لاگ محاسبے سے انبیا تک نہیں بچ سکے ہیں تا بدیگراں چہ رسد- دوسرے یہ کہ بندے کے لیے صحیح رویّہ قصور کر کے اکڑنا نہیں ہے بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ جس وقت بھی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جاتے اُسی وقت وہ عاجزی کے ساتھ اپنے رب کے آگے جھک جاتے - اسی رویہ کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان بزرگوں کی لغزشوں کو محض معاف ہی نہیں کیا بلکہ ان کو اور زیادہ الطاف و عنایات سے نوازا -

یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ فتنہ کیا تھا جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام پڑ گئے تھے؟ اور اُن کی کرسی پر ایک جسد لا کر ڈال دینے کا کیا مطلب ہے؟ اور اس جسد کا لا کر ڈالا جانا اُن کے لیے کس نوعیت کی تنبیہ تھی جس پر انہوں نے توبہ کی؟ اس کے جواب میں مفسرین نے چار مختلف مسلک اختیار کیے ہیں -

ایک گروہ نے ایک لمبا چوڑا افسانہ بیان کیا ہے جس کی تفصیلات میں ان کے درمیان بہت کچھ اختلافات ہیں - مگر سب کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان سے یا تو یہ قصور ہوا تھا کہ ان کے محل میں ایک بیگم چالیس دن تک بُت پرستی کرتی رہی اور وہ اس سے بے خبر رہے، یا یہ کہ وہ چند روز تک گھر میں بیٹھے رہے اور کسی مظلوم کی دادرسی نہ کی - اس پر ان کو یہ سزا ملی کہ ایک شیطان کسی نہ کسی طرح ان کی وہ انگوٹھی اڑا لے گیا جس کی بدولت وہ جن و انس اور ہواؤں پر حکومت کرتے تھے - انگوٹھی ہاتھ سے جاتے ہی حضرت سلیمان کا سارا اقتدار چھن گیا اور وہ چالیس دن تک دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرے - اور اس دوران میں وہ شیطان سلیمان بنا ہوا حکمرانی کرتا رہا - سلیمانؑ کی کرسی پر ایک جسد لا کر ڈال دینے سے مراد یہی شیطان ہے جو ان کی کرسی پر بیٹھ گیا تھا - بعض حضرات یہاں تک بھی کہہ گزرتے ہیں کہ اس زمانے میں اُس شیطان سے حرمِ سلیمانی کی خواتین تک کی عصمت محفوظ نہ رہی - آخرکار سلطنت کے اعیان و اکابر اور علما کو اس کی کارروائیاں دیکھ کر شک ہو گیا کہ یہ سلیمان نہیں ہے - چنانچہ انہوں نے اس کے سامنے توراۃ کھولی اور وہ ڈر کر بھاگ نکلا - راستے میں انگوٹھی اس کے ہاتھ سے سمندر میں گر گئی، یا خود اُسی نے پھینک دی، اور اسے ایک مچھلی نے نگل لیا - پھر اتفاق سے وہ

مچھلی حضرت سلیمان کو مل گئی۔ آسے پکانے کے لیے انہوں نے اس کا پیٹ جو چاک کیا تو انگوٹھی نکل آئی اور اس کا ہاتھ آنا تھا کہ جن و انس سب سلام کرتے ہوتے اُن کے سامنے حاضر ہو گئے ــــــ یہ پُورا افسانہ از سرتا پا خرافات پر مشتمل ہے جنہیں نو مسلم اہلِ کتاب نے تلمود اور دوسری اسرائیلی روایات سے اخذ کر کے مسلمانوں میں پھیلا دیا تھا اور حیرت ہے کہ ہمارے ہاں کے بڑے بڑے لوگوں نے ان کو قرآن کے مجملات کی تفصیلات سمجھ کر اپنی زبان سے نقل کر دیا۔ حالانکہ نہ انگشتری سلیمانی کی کوئی حقیقت ہے نہ حضرت سلیمان کے کمالات کسی انگشتری کے کرشمے تھے، نہ شیاطین کو اللہ نے یہ قدرت دی ہے کہ انبیاء کی شکل بنا کر آئیں اور خلقِ خدا کو گمراہ کریں، اور نہ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ کسی نبی کے قصور کی سزا ایسی فتنہ انگیز شکل میں دے جس سے شیطان نبی بن کر ایک پوری اُمت کا ستیاناس کر دے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرآن خود اِس تفسیر کی تردید کر رہا ہے۔ آگے کی آیات میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب یہ آزمائش حضرت سلیمان کو پیش آئی اور انہوں نے ہم سے معافی مانگ لی تب ہم نے ہوا اور شیاطین کو ان کے لیے مسخر کر دیا۔ لیکن یہ تفسیر اس کے برعکس یہ بتا رہی ہے کہ شیاطین پہلے ہی انگشتری کے طفیل حضرت سلیمان کے تابع فرمان تھے۔ تعجب ہے کہ جن بزرگوں نے یہ تفسیر بیان کی ہے انہوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ بعد کی آیات کیا کہہ رہی ہیں۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے ہاں ۲۰ سال کے بعد ایک لڑکا پیدا ہوا۔ شیاطین کو خطرہ ہوا کہ اگر سلیمان کے بعد یہ بادشاہ ہو گیا تو ہم پھر اسی غلامی میں مبتلا رہیں گے۔ اِس لیے انہوں نے اسے قتل کر دینے کی ٹھانی۔ حضرت سلیمان کو اس کا علم ہو گیا اور انہوں نے اس لڑکے کو بادلوں میں چھپا دیا تاکہ وہیں اس کی پرورش ہوتی رہے۔ یہی وہ فتنہ تھا جس میں حضرت مبتلا ہوتے تھے کہ انہوں نے اللہ پر توکل کرنے کے بجائے بادلوں کی حفاظت پر اعتماد کیا۔ اِس کی سزا ان کو یہ دی گئی کہ وہ بچہ مر کر ان کی کرسی پر آ گرا ــــــ یہ افسانہ بھی بالکل بے سروپا اور صریح قرآن کے خلاف ہے، کیونکہ اس میں بھی یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہوائیں اور شیاطین پہلے سے حضرت سلیمان کے لیے مسخر تھے، حالانکہ قرآن صاف الفاظ میں ان کی تسخیر کو اِس فتنے کے بعد کا واقعہ بتا رہا ہے۔

تیسرا گروہ کہتا ہے کہ حضرت سلیمان نے ایک روز قسم کھائی کہ آج رات میں اپنی ستر بیویوں کے پاس جاؤں گا اور ہر ایک سے ایک مجاہد فی سبیل اللہ پیدا ہوگا، مگر یہ بات کہتے ہوئے انہوں نے انشاء اللہ نہ کہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف ایک بیوی حاملہ ہوئیں اور ان سے بھی ایک ادھورا بچہ پیدا ہوا جسے دائی نے لا کر حضرت سلیمان کی کرسی پر ڈال دیا۔ یہ حدیث حضرت ابو ہریرہؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے اور اسے بخاری و مسلم اور دوسرے محدثین نے متعدد طریقوں سے نقل کیا ہے۔ خود بخاری میں مختلف مقامات پر یہ روایت جن طریقوں سے نقل کی گئی ہے ان میں سے کسی میں بیویوں کی تعداد ۶۰ بیان کی گئی ہے، کسی میں ۷۰، کسی میں ۹۰، کسی میں ۹۹، اور کسی میں ۱۰۰۔ جہاں تک اسناد کا تعلق ہے، ان میں سے اکثر روایات کی سند قوی ہے، اور باعتبار روایت اس کی صحت میں کلام نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن حدیث کا مضمون صریح عقل کے خلاف ہے اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ہرگز نہ فرمائی ہوگی جس طرح وہ نقل ہوئی ہے، بلکہ آپ نے غالباً یہود کی یاوہ گوئیوں کا ذکر کرتے ہوئے کسی موقع پر اسے بطور مثال بیان فرمایا ہوگا۔ اور سامع کو یہ غلط فہمی لاحق ہو گئی کہ اس بات کو حضور خود بطور واقعہ بیان فرما رہے ہیں۔ ایسی روایات کو محض صحتِ سند کے زور پر لوگوں کے حلق سے اتروانے کی کوشش کرنا دین کو مضحکہ بنانا ہے۔ ہر شخص خود حساب لگا کر دیکھ سکتا ہے کہ جاڑے کی طویل ترین رات میں بھی عشاء اور فجر کے درمیان دس گیارہ گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں ہوتا۔ اگر بیویوں کی کم سے کم تعداد ۶۰ ہی مان لی جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اُس رات بغیر دم لیے فی گھنٹہ ۶ بیوی کے حساب سے مسلسل دس گھنٹے یا ۱۱ گھنٹے مباشرت کرتے چلے گئے۔ کیا یہ عملاً ممکن بھی ہے؟ اور کیا یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ حضورؐ نے یہ بات واقعے کے طور پر بیان کی ہوگی؟ پھر حدیث میں یہ بات کہیں نہیں بیان کی گئی ہے کہ قرآن مجید میں حضرت سلیمان کی کرسی پر جس جسد کے ڈالے جانے کا ذکر آیا ہے اس سے مراد یہی ادھورا بچہ ہے۔ اس لیے یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ حضورؐ نے یہ واقعہ اس آیت کی تفسیر کے طور پر بیان فرمایا تھا۔ علاوہ بریں اس بچے کی پیدائش پر حضرت سلیمانؑ کا استغفار کرنا تو سمجھ میں آتا ہے، مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ انہوں نے استغفار کے ساتھ

یہ دعا کیوں مانگی کہ "مجھے وہ بادشاہی دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو۔"

ایک اور تفسیر جس کو امام رازی ترجیح دیتے ہیں یہ ہے کہ حضرت سلیمان کسی سخت مرض میں مبتلا ہو گئے تھے، یا کسی خطرے کی وجہ سے اس قدر متفکر تھے کہ گھلتے گھلتے وہ بس ہڈی اور چمڑا بن کر رہ گئے تھے۔ لیکن یہ تفسیر قرآن کے الفاظ کا ساتھ نہیں دیتی۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں کہ "ہم نے سلیمان کو آزمائش میں ڈالا اور اس کی کرسی پر ایک جسد لا کر ڈال دیا، پھر اس نے رجوع کیا" ان الفاظ کو پڑھ کر کوئی شخص بھی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ اس جسد سے مراد خود حضرت سُلیمان ہیں۔ ان سے تو صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ آزمائش میں ڈالے جانے سے مراد کوئی قصور ہے جو آنجناب سے صادر ہوا تھا، اس قصور پر آپ کو تنبیہ اس شکل میں فرمائی گئی کہ آپ کی کرسی پر ایک جسد لا ڈالا گیا، اور اس پر جب آپ کو اپنے قصور کا احساس ہوا تو آپ نے رجوع فرما لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ مقام قرآن مجید کے مشکل ترین مقامات میں سے ہے اور حتمی طور پر اس کی کوئی تفسیر بیان کرنے کے لیے ہمیں کوئی یقینی بنیاد نہیں ملتی۔ لیکن حضرت سلیمان کی دعا کے یہ الفاظ کہ "اے میرے رب، مجھے معاف کر دے اور مجھ کو وہ بادشاہی دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو،" اگر تاریخ بنی اسرائیل کی روشنی میں پڑھے جائیں تو بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے دل میں غالباً یہ خواہش تھی کہ ان کے بعد ان کا بیٹا جانشین ہو اور حکومت و فرمانروائی آئندہ انہی کی نسل میں باقی رہے۔ اسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں "فتنہ" قرار دیا اور اس پر وہ اس وقت متنبہ ہوئے جب اُن کا ولیعہد رُحبعام ایک ایسا نالائق نوجوان بن کر اٹھا جس کے کچھن صاف بتا رہے تھے کہ وہ داؤد و سلیمان علیہما السلام کی سلطنت چار دن بھی نہ سنبھال سکے گا۔ اُن کی کرسی پر ایک جسد لا کر ڈالے جانے کا مطلب غالباً یہی ہے کہ جس بیٹے کو وہ اپنی کرسی پر بٹھانا چاہتے تھے وہ ایک کندۂ ناتراش تھا، تب انہوں نے اپنی اس خواہش سے رجوع کیا، اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ کر درخواست کی کہ بس یہ بادشاہی مجھی پر ختم ہو جائے، میں اپنے بعد اپنی نسل میں بادشاہی جاری رہنے کی تمنا سے باز آیا۔ بنی اسرائیل کی تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنے بعد کسی کے لیے بھی

نرمی کے ساتھ چلتی تھی جدھر وہ چاہتا تھا،[۳۷] اور شیاطین کو مسخر کر دیا، ہر طرح کے معمار اور غوطہ خور اور دوسرے جو پابندِ سلاسل تھے۔[۳۸] (ہم نے اُس سے کہا) "یہ ہماری بخشش ہے تجھے اختیار ہے جسے چاہے دے اور جس سے چاہے روک لے، کوئی حساب نہیں۔"[۳۹]

جانشینی کی نہ وصیت کی اور نہ کسی کی اطاعت کے لیے لوگوں کو پابند کیا۔ بعد میں ان کے اعیانِ سلطنت نے رحبعام کو تخت پر بٹھایا، مگر کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ بنی اسرائیل کے دس قبیلے شمالی فلسطین کا علاقہ لے کر الگ ہو گئے اور صرف یہوداہ کا قبیلہ بیت المقدس کے تخت سے وابستہ رہ گیا۔

۳۷۔ اس کی تشریح سورۂ انبیاء کی تفسیر میں گزر چکی ہے (تفہیم القرآن جلد سوم، ص ۱۷۶-۱۷۷) البتہ یہاں ایک بات وضاحت طلب ہے۔ سورۂ انبیاء میں جہاں حضرت سلیمان کے لیے ہوا کو مسخر کرنے کا ذکر کیا گیا ہے وہاں الریحَ عاصفۃً (بادِ تند) کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں، اور یہاں اسی ہوا کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ تجری بِاَمْرِہٖ رُخَاءً (وہ اس کے حکم سے نرمی کے ساتھ چلتی تھی)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہوا بجائے خود تو بادِ تند تھی، جیسی کہ بادبانی جہازوں کو چلانے کے لیے درکار ہوتی ہے، مگر حضرت سلیمان کے لیے وہ اس معنی میں نرم بنا دی گئی تھی کہ جدھر اُن کے تجارتی بیڑوں کو سفر کرنے کی ضرورت ہوتی تھی اُسی طرف وہ چلتی تھی۔

۳۸۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد سوم، صفحات ۱۷۶-۱۷۸-۵۶۲-۵۶۳-۵۶۶-۵۶۸-۵۷۵-۵۷۶۔ شیاطین سے مراد جن ہیں۔ اور "پابندِ سلاسل شیاطین" سے مراد وہ خدمتگار شیاطین ہیں جنہیں شرارت کی پاداش میں مقید کر دیا جاتا تھا۔ ضروری نہیں ہے کہ وہ بیڑیاں اور زنجیریں جن سے یہ شیاطین باندھے جاتے تھے، لوہے کی ہی بنی ہوئی ہوں اور قیدی انسانوں کی طرح وہ بھی لوگوں کو علانیہ بندھے ہوتے نظر آتے ہوں۔ بہر حال انہیں کسی ایسے طریقے سے مقید کیا جاتا تھا جس سے وہ بھاگنے اور شرارت کرنے پر قادر نہ رہتے تھے۔

۳۹۔ اس آیت کے تین مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ ہماری بے حساب بخشش ہے تمہیں اختیار ہے کہ جسے چاہو دو اور جسے چاہو نہ دو۔ دوسرے یہ کہ یہ ہماری بخشش ہے، جسے چاہو دو

یقیناً اُس کے لیے ہمارے ہاں تقرب کا مقام اور بہتر انجام ہے ؏ ۳ع

اور جسے چاہو نہ دو، دینے یا نہ دینے پر تم سے کوئی محاسبہ نہ ہو گا۔ ایک اور مطلب بعض مفسرین نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ یہ شیاطین کلیتہً تمہارے تصرف میں دے دیئے گئے ہیں، اِن میں سے جسے چاہو رہا کر دو اور جسے چاہو روک رکھو، اس پر کوئی محاسبہ تم سے نہ ہو گا۔

تلہ اِس ذکر سے اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بندے کی اکڑ حقیقی مبغوض ہے، اُس کی عاجزی کی ادا اتنی ہی محبوب ہے۔ بندہ اگر قصور کرے اور تنبیہ کرنے پر اُلٹا اور زیادہ اکڑ جائے تو انجام وہ ہوتا ہے جو آگے آدم و ابلیس کے قصے میں بیان ہو رہا ہے۔ اس کے برعکس ذرا سی لغزش بھی اگر بندے سے ہو جائے اور وہ توبہ کر کے عاجزی کے ساتھ اپنے رب کے آگے جھک جائے تو اس پر وہ نوازشات فرمائی جاتی ہیں جو داؤد و سلیمان علیہما السلام پر فرمائی گئیں۔ حضرت سلیمانؑ نے استغفار کے بعد جو دعا کی تھی، اللہ تعالیٰ نے اسے لفظ بلفظ پورا کیا اور ان کو فی الواقع ایسی بادشاہی دی جو نہ اُن سے پہلے کسی کو ملی تھی، نہ اُن کے بعد آج تک کسی کو عطا کی گئی۔ ہواؤں پر تصرّف اور جنوں پر حکمرانی ایک ایسی غیر معمولی طاقت ہے جو انسانی تاریخ میں صرف حضرت سلیمان ہی کو بخشی گئی ہے، کوئی دوسرا اس میں ان کا شریک نہیں ہے۔

خریدارانِ ترجمان

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں۔ جو کہ ان کے پتہ کی چٹ پر لکھا ہوتا ہے۔ ورنہ عدم تعمیل کی شکایت کا دفتر ذمہ دار نہ ہو گا۔

منیجر ترجمان القرآن

حبش اور مسلمانوں کے تعلقات

عمر فاروق مودودی

(۲)

کفارِ قریش کی سفارت قریش کو جب معلوم ہوا کہ حبشہ میں مسلمان خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہیں تو انہوں نے تحائف کے ساتھ عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص پر مشتمل ایک وفد بھیجا تاکہ کسی طرح مسلمانوں کو حبشہ سے نکلوا کر پھر مکّے لایا جاتے۔ اس وفد نے حبشہ پہنچ کر پہلے تو نجاشی کے درباریوں اور پادریوں کو تحفے دیتے اور پھر ان سے کہا کہ مکّہ سے کچھ غلام اور کچھ ادنیٰ درجہ کے لوگ بھاگ کر آپ کے ہاں چلے آتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے اجداد کے مذہب کو چھوڑ دیا ہے اور آپ کا دین بھی قبول نہیں کیا بلکہ ایک نیا ہی دین ایجاد کر لیا ہے جسے نہ ہم جانتے ہیں نہ آپ ہم کو ان کی قوم کے شرفا نے بادشاہ کی خدمت میں بھیجا ہے کہ وہ انہیں ان کی قوم کے پاس واپس بھیج دے۔ اس لیے جب ہم بادشاہ سے گفتگو کریں تو آپ بادشاہ کو مشورہ دیں کہ وہ انہیں ہمارے حوالے کر دے، اور ان سے کوئی بات نہ کرے۔ پادریوں نے ان کی سفارش کرنے کا وعدہ کر لیا۔

پھر یہ لوگ نجاشی کے دربار میں پہنچے اور تحائف پیش کر کے وہی بات دُہرائی جو وہ پادریوں سے کہہ چکے تھے کہ ان لوگوں نے ایک نیا دین ایجاد کر لیا ہے جسے نہ ہم جانتے ہیں نہ آپ۔ البتہ مزید یہ کہا کہ ان لوگوں میں سے جو غلام نہیں ہیں ان کے باپ، چچا اور رشتہ دار ہمارے ہاں موجود ہیں اور وہی ان کی نگرانی کے زیادہ مستحق ہیں۔ جب یہ لوگ اپنی درخواست پیش کر چکے تو پادریوں نے نجاشی سے کہا کہ انہوں نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ ان کی قوم ہی ان کی نگرانی کی زیادہ مستحق ہے۔ اس لیے آپ اُن کو اِن کے حوالے کر دیجیے۔ نجاشی نے جواب دیا کہ جن لوگوں نے میرے پاس پناہ لی، میرے ملک میں آکر ٹھیرے اور دوسروں کو چھوڑ کر مجھے اختیار کیا میں

انہیں اس وقت تک اِن کے حوالے نہیں کر سکتا جب تک کہ میں انہیں بلاکر، جو کچھ یہ دونوں ان کے بارے میں کہتے ہیں، اس کے متعلق ان سے دریافت نہ کر لوں۔ اگر وہ وہی ہوتے جو کچھ یہ کہتے ہیں تو میں انہیں ان کے حوالے کردوں گا اور ان کی قوم کی طرف واپس بھیج دوں گا۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو میں ان کی حفاظت کرونگا اور جب تک وہ لوگ میری پناہ میں رہیں گے ان کو پناہ دیتا رہوں گا۔

نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر کی تقریر اس کے بعد نجاشی نے ایلچی بھیج کر مسلمانوں کو بلایا۔ جب مسلمانوں کو بادشاہ کا یہ پیغام پہنچا تو سب جمع ہوئے اور انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ بادشاہ کے سامنے کیا بات کہی جائے۔ آخر کار سب نے یہ فیصلہ کیا کہ قسم بخدا ہم وہی کہیں گے جو ہمیں معلوم ہے اور جس کا ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیں حکم دیا ہے۔ جو کچھ ہونا ہے ہو جائے۔ آپس میں یہ گفتگو کرنے کے بعد مسلمان نجاشی کے دربار میں حاضر ہوئے۔

نجاشی نے ان سے پوچھا، "یہ کونسا دین ہے جس کی خاطر تم نے اپنی قوم کو چھوڑ دیا؟ پھر نہ تم میرے ہی دین میں داخل ہوئے، نہ اور جو دوسری ملتیں ہیں اُن ہی میں سے کسی کے دین کو تم نے اختیار کیا"

حضرت جعفر نے جواب دیا، "اے بادشاہ! ہم ایک جاہل قوم تھے۔ بُتوں کی پرستش کرتے تھے، مُردار کھاتے تھے۔ فواحش کا ارتکاب کرتے تھے، قطع رحمی کرتے تھے، ہمسایوں کے ساتھ بد سلوکی کرتے تھے اور ہم میں کا طاقتور کمزور کو کھا جاتا تھا۔ ہم اسی حالت میں تھے کہ اللہ نے خود ہماری قوم میں سے ایک رسول ہماری طرف بھیجا جس کے نسب، صداقت و امانت اور بے داغ سیرت سے ہم اچھی طرح واقف تھے۔ اس نے ہمیں اللہ کی طرف بلایا کہ ہم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں، اُسی کی عبادت کریں اور اس کے سوا جن پتھروں اور بتوں کو ہم اور ہمارے باپ دادا پُوجتے رہے ہیں، چھوڑ دیں۔ اس نے ہمیں حکم دیا کہ ہم سچ بولیں، امانتیں ادا کریں، صلۂ رحمی کریں، ہمسائے کے ساتھ اچھا سلوک کریں اور تمام حرام کاموں اور خونریزی

سے بچیں۔ اس نے ہمیں بے حیائی سے، جھوٹ سے، یتیم کا مال کھانے سے، پاکدامن عورتوں پر تہمت لگانے سے روکا۔ اس نے ہمیں حکم دیا کہ ہم اللہ کی ہی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں۔ اس نے ہمیں نماز پڑھنے، زکوٰۃ دینے اور روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ ہم نے اس کی تصدیق کی، اس پر ایمان لاتے اور جو کچھ وہ منجانب اللہ کہتا تھا ہم اس کی تعمیل کرنے لگے۔ ہم نے اللہ کی عبادت کی اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھیرایا۔ جو چیز ہم پر حرام کی گئی ہم نے بھی اسے حرام کر دیا اور جو چیز ہم پر حلال کی گئی، ہم نے بھی اسے حلال کر دیا۔ اس پر ہماری قوم ہماری دشمن ہو گئی اس نے ہمیں اذیتیں پہنچائیں اور ہمیں ہمارے دین سے پھیرنے کی کوشش کی تاکہ ہم کو اللہ کی بندگی سے ہٹا کر پھر بت پرستی کی طرف لے جائیں اور جن خبائث کو پہلے حلال کیے بیٹھے تھے ان کو پھر حلال کریں۔ جب ان لوگوں نے ہم کو دبا لیا اور ہم پر ظلم و ستم کیے، ہم پر زندگی اجیرن کر دی اور ہمارے دین کے آڑے آ گئے تو ہم آپ کے ملک کی طرف نکل کھڑے ہوئے اور دوسروں کو چھوڑ کر ہم نے آپ کو اختیار کر لیا۔ ہم نے آپ کے ہاں پناہ لی اور اے بادشاہ! ہمیں امید تھی کہ آپ کے ملک میں ہم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

حضرت جعفر کی یہ تقریر سُن کر نجاشی نے کہا "تمہارے نبی پر جو کچھ اُترا ہے اس میں سے کوئی چیز تمہارے پاس ہے؟" حضرت جعفر نے جواب میں سورۂ مریم کی ابتدائی آیات تلاوت فرمائیں۔ یہ آیات سُن کر نجاشی اور اس کے پادریوں پر گریہ طاری ہو گیا یہاں تک کہ ان کی ڈاڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ پھر نجاشی نے کہا "بے شک یہ کلام اور وہ کلام جو حضرت عیسیٰ لاتے تھے ایک ہی طاق کے دو چراغ ہیں۔" اس کے بعد اس نے قریش کے وفد کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ تم دونوں چلے جاؤ، خدا کی قسم! میں انہیں تمہارے حوالے نہیں کروں گا۔

حضرت عیسیٰ کے بارے میں مسلمانوں کی صاف گوئی | دوسرے دن قریش کے دونوں ایلچی پھر نجاشی کے دربار میں گئے اور اس سے کہا کہ اے بادشاہ! یہ لوگ عیسیٰ بن مریم کے بارے میں ایک بہت بڑی بات کہتے ہیں۔ آپ انہیں بلوائیے اور ان سے دریافت کیجیے۔ نجاشی نے

پھر ایلچی بھیج کر مسلمانوں کو بلوایا اور ان سے پوچھا کہ تم لوگ عیسیٰ بن مریم کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ حضرت جعفرؓ نے جواب دیا "ہم ان کے بارے میں وہی کہتے ہیں جو ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ان کی شان میں نازل ہوا ہے: "وہ اللہ کے بندے تھے، اس کے رسول تھے، اس کی طرف سے ایک روح تھے اور اس کا کلمہ تھے جو اس نے کنواری مریم کی طرف القاء کیا تھا" نجاشی نے یہ سُنا تو زمین سے ایک تنکا اٹھا کر کہا "خدا کی قسم! جو کچھ تم نے کہا عیسیٰ بن مریم اس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں تھے" پادری یہ سُن کر بگڑ گئے مگر نجاشی نے ان کے بگڑنے کی چنداں پروا نہ کی اور مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہا "تم لوگ جاؤ، تم میرے ملک میں بالکل محفوظ ہو۔ اگر کوئی تمہارے ساتھ بدسلوکی کرے گا تو میں اس پر جرمانہ کروں گا" اور اپنے درباریوں سے کہا کہ "ان دونوں کے لاتے ہوئے تحائف انہیں واپس کر دو، مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ نے جب میرا ملک مجھے واپس دیا تو اس پر مجھ سے کوئی رشوت نہیں لی[1]۔ اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اُس کے معاملے میں رشوت قبول کر لوں۔ اس نے میرے معاملے میں لوگوں کی بات نہ مانی اور میں اس کے بارے میں دوسروں کی بات مان لوں"

اس طرح مسلمان مہاجرین سرزمین حبشہ میں بڑے اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے

<u>نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حبش کے وفود</u>: بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مسلمان حبشہ پہنچے اور نجاشی کو اس نئے دین کا علم ہوا تو اس نے حقیقتِ حال معلوم کرنے کے لیے ایک وفد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر اپنی تفسیر میں حضرت سعید بن جُبیر کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ "نجاشی نے حبشہ سے ایک وفد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا تا کہ یہ لوگ آپ کا کلام سنیں اور آپ کی صفات دیکھیں۔ اس وفد کے ارکان کی تعداد علیٰ اختلاف الرواۃ بارہ تھی جن میں سات پادری اور پانچ راہب تھے۔ جب ان لوگوں نے رسول اللہ

---

[1] نجاشی کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تخت نشینی کا پس منظر جو مورخین نے بیان کیا ہے اور جس کا ذکر ہم بھی اوپر کر آئے ہیں وہ درست ہے۔

صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے قرآن مجید پڑھا تو یہ لوگ مسلمان ہو گئے اور ان پر گریہ وزاری اور خشوع و خضوع کی کیفیات طاری ہوئیں پھر یہ لوگ نجاشی کے پاس واپس گئے اور جو کچھ دیکھا تھا بیان کر دیا۔

ابن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ حبشہ کے کم و بیش بیس نصرانی مکہ معظمہ آئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حرم میں تشریف فرما تھے۔ یہ لوگ بھی آپ کے پاس جا بیٹھے اور آپؐ سے بعض مسائل میں گفتگو کرنے لگے۔ ان کی اس مجلس میں اکابر قریش کے کچھ لوگ بھی موجود تھے۔ جب یہ نصرانی اپنے سوالات دریافت کر چکے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں توحید کی دعوت دی اور قرآن مجید پڑھ کر سنایا۔ قرآن مجید سن کر ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ پھر وہ لوگ اللہ تعالیٰ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور آپ کی تصدیق کی۔ جب یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے اٹھے تو قریش کے جو لوگ کعبہ کے اردگرد بیٹھے ہوئے یہ منظر دیکھ رہے تھے ان میں سے ابوجہل اٹھا اور اس نے ان سے کہا کہ "اے قافلہ والو! اللہ تم کو نامراد کرے، تم کو تمہارے اہلِ دین نے اس غرض سے بھیجا تھا کہ تم اس شخص (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خبر ان کے پاس لے کر جاؤ۔ لیکن اس (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس تمہاری مجالست کو اس وقت تک چین نہ آیا جب تک کہ تم اپنے دین سے جدا نہ ہو گئے۔ اور جب تک کہ تم نے اس (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تصدیق نہ کی۔ تم سے زیادہ احمق قافلہ والے ہم نے نہیں دیکھے"۔ اس وفد نے جواب میں کہا کہ سلام علیکم، ہم تم سے نہیں جھگڑتے، ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں، تمہارے اعمال تمہارے لیے۔

دونوں روایات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نفسِ واقعہ ایک ہے البتہ تفصیلات میں فرق ہے۔ بہر حال اگر یہ روایت درست ہے، اور درست نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں تو نجاشی کی طرف سے مسلمانوں کے ساتھ غیر معمولی ہمدردی میں اس واقعے کو بھی بڑا دخل ہے۔

نجاشی کے ساتھ حضورؐ کے تعلقات محرم سنہ ۶ھ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی ضمرہ کے ایک صحابی حضرت عمرو بن امیہ کے ہاتھ نجاشی کو ایک خط بھیج کر اسلام کی دعوت دی۔ چنانچہ نجاشی

نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد ۷ھ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی عمرو بن امیہ ضمری کے ہاتھ نجاشی کو دوسرا مراسلہ بھیجا اور اس سے کہا کہ ام حبیبہ رملہ بنت ابوسفیان کا عقد میرے ساتھ کر دو، کیونکہ حضرت ام حبیبہ کے شوہر عبید اللہ بن جحش نے حبشہ میں عیسائیت اختیار کر لی تھی اور وہ مر بھی چکا تھا۔ نجاشی کو جب یہ پیغام پہنچا تو اس نے اپنی خاص لونڈی ابرہہ کو حضرت ام حبیبہؓ کے پاس بھیجا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی خبر دی۔ پھر حضرت جعفر اور دوسرے مسلمانوں کی موجودگی میں اس نے خود نکاح کا خطبہ پڑھا اور چار سو دینار مہر اپنے پاس سے ادا کیا۔ نکاح کے بعد نجاشی نے حضرت ام حبیبہ کو شرحبیل ابن حسنہ کے ساتھ مدینہ منورہ بھیج دیا۔

اسی سال نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن امیہ ضمریؓ کے ذریعے نجاشی کو تیسرا مراسلہ بھیجا کہ وہ حبشہ میں باقی ماندہ مہاجرین کو واپس بھیج دے۔ چنانچہ نجاشی نے مہاجرین کو بہت کچھ مال و متاع دے کر عمرو بن امیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ بھیج دیا۔ حضرت جعفر بھی انہی لوگوں میں شامل تھے۔ یہ لوگ فتح خیبر کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے۔

ہجرت کے نویں سال نجاشی کا انتقال ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وفات کا اعلان فرمایا کہ "مسلمانو! آج تمہارے صالح بھائی اصحمہ نے وفات پائی، اس کے لیے دعائے مغفرت مانگو"۔ اس کے بعد آپ نے اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کو کچھ تحائف بھیجے تھے۔ لیکن قاصد نے واپس آکر نجاشی کے انتقال کی خبر سنائی۔

حضورؐ کے بعد کی تاریخ | ۱۱ھ / ۶۳۲ء میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حبشہ اور مسلمانوں کے تعلقات قریب قریب ختم ہو گئے۔ عرب مؤرخین اور جغرافیہ نویس جیسے حبشہ کو بالکل بھول گئے۔ تا آنکہ پندرھویں صدی عیسوی میں مقریزی نے "الالمام بمن فی ارض الحبشۃ من ملوک الاسلام" کے نام سے اپنے زمانے کے حبشہ کی تاریخ لکھی۔ اس طرح سے ساتویں صدی

عیسوی سے لیکر تیرھویں صدی عیسوی تک کا زمانہ حبشہ پر ایسا گذرا کہ جس کی کوئی تاریخ موجود نہیں ہے۔ لیکن دوسرے ذرائع سے جو کچھ معلوم ہو سکا ہے وہ مختصراً یہ ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کے بعد سے حبشہ میں یہودی اثرات بڑھنے لگے۔ بکثرت لوگوں نے عیسائیت ترک کر دی یہاں تک کہ دسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں حبشہ کے شمال مشرقی یہودی علاقے میں کی ملکہ یودیت یہودی باغیوں کی سرغنہ بن گئی اور اس نے قبیلہ زاجوا کے بھی ایک بڑے حصے کو جو عیسائی تھا، اپنے ساتھ ملا کر سلطنت اکسوم پر حملہ کر دیا۔ شہر جلا ڈالے، کلیسا ویران کر ڈالے اور ملک پر قابض ہو گئی۔

اس ملکہ کے بعد قبیلہ زاجوا برسر اقتدار آگیا اور ۳۴۳ برس میں اس کے گیارہ بادشاہوں نے ملک پر حکمرانی کی۔ اگرچہ یہ خاندان ملکہ کا قرابت دار تھا مگر یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ ان سب کا دین مسیحیت تھا البتہ ان کی مسیحیت اور اکسومیوں کی مسیحیت میں بڑا فرق تھا۔

قبیلۂ اھمرہ کا تسلط | یہ خاندان ابھی برسر اقتدار تھا کہ قبیلہ اھمرہ کا ایک شخص جس کا نام یکونو املاک تھا یہ دعویٰ لے کر اٹھا کہ وہ حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کی نسل سے ہے۔ اور اس دعوے کے ساتھ اس نے اقتدار کے حصول کی کوششیں شروع کر دیں۔ بالآخر ۱۲۷۰ء میں اس نے حبشہ کے تخت پر قبضہ کر لیا اور حبشہ میں دولتِ سلیمانیہ کی بنیاد رکھ دی جو آج تک قائم ہے۔ درحقیقت یہ داستان بھی یہودیوں کی اختراع تھی۔ جو یہودی فلسطین سے بھاگ کر حبشہ پہنچے تھے، وہ اپنے ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکۂ سبا کا قصہ بھی لے گئے تھے اور اس پر خوب خوب حاشیے چڑھائے تھے۔ مختصراً ان کا گھڑا ہوا قصہ یہ ہے کہ جب ملکہ سبا نے، جس کو حبشی یہودی "ماقدہ" کے نام سے یاد کرتے ہیں، حضرت سلیمان علیہ السلام سے نکاح کر لیا تو ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام الاسطورہ بن حکیم سلیمان تھا۔ یہ قصہ قدیم زمانے سے حبشی عوام میں مشہور تھا اور دولت اکسوم کے فرمانروا بھی اپنے آپ کو اسطورہ بن حکیم سلیمان کی جانب منسوب کرتے تھے۔ بہرحال یہ قصہ صحیح ہو یا غلط اور یکونو املاک کا دعویٰ مبنی

برصحت ہو یا نہ ہو لیکن اس قصّے کی شہرت سے اس نے فائدہ اٹھایا اور اپنے اقتدار کی راہ صاف کرلی۔

یکونو املاک کی تخت نشینی عظیم سیاسی اور معاشرتی تغیرات کی حامل تھی۔ اس نے حبشہ کے علاقے امہرہ کو جو قبیلہ امہرہ کا مسکن تھا ملک کا دارالحکومت بنایا، اس طرح سے ملک کا مرکز ثقل اکسوم سے منتقل ہوکر امہرہ میں آگیا۔ اس کے ساتھ ہی ملک کی سرکاری زبان بجائے جعز کے امہریہ ہوگئی۔ مذہبًا یکونو املاک اور اس کے جانشین فرقہ لعقوبیہ کے عیسائی اور شدید مذہبی تعصب کے حامل تھے۔ (باقی)

خطباتِ حرم

دوسرا خطبہ

حمد و ثنا کے بعد:

برادران اسلام۔ ہر عبادت کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن۔ ظاہر سے مراد وہ عملی شکل ہے جو کسی عبادت کو ادا کرنے کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ اور باطن سے مراد وہ معنی ہیں جو اس عملی شکل میں مضمر ہوتے ہیں اور جن کے اظہار کی خاطر عمل کی وہ خاص شکل مقرر کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر نماز کا ظاہر یہ ہے کہ آدمی قبلہ رُخ کھڑا ہو، رکوع کرے، سجدہ کرے، بیٹھے، اور ان ظاہری افعال سے نماز کی جو شکل قائم کی جاتی ہے اُس سے مقصود دراصل اس معنی کا اظہار ہے کہ بندہ اپنے رب کے حضور بندگی کا اعتراف کرنے کے لیے حاضر ہوا ہے، اس کے مقابلے میں اپنی انانیت سے دست بردار ہو رہا ہے، اس کی بڑائی اور اپنی عاجزی تسلیم کر رہا ہے، اور اس کے آگے اپنے وہ معروضات پیش کر رہا ہے جو اس کی زبان سے ادا ہو رہے ہیں۔ اب دیکھیے جو شخص نماز کی ظاہری شکل کو ٹھیک ٹھیک احکام و ہدایات کے مطابق قائم کر دے وہ بلا شبہ ادائے نماز کی قانونی شرائط پوری کر دیتا ہے۔ اس کے متعلق آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے نماز نہیں پڑھی، یا اس کے ذمّہ فرض باقی رہ گیا۔ لیکن آپ غور کریں گے تو خود محسوس کریں گے کہ نماز کا پُورا پُورا فائدہ وہی شخص اٹھا سکتا ہے جو نماز کے اعمال میں سے ہر عمل کرتے وقت اُس کی رُوح کو بھی نگاہ میں رکھے، اور نماز کے اذکار میں سے ہر ذکر کو زبان سے ادا کرتے ہوئے اس کے معنی کی طرف بھی متوجہ رہے۔

ایسا ہی معاملہ حج کا ہے۔ اس کو ادا کرنے کا جو طریقہ مقرر کیا گیا ہے اُس پر آپ خواہ سمجھ کر عمل کریں یا بے سمجھے بوجھے، بہرحال جب آپ شارع کے مقرر کردہ مناسک ادا کر دیں گے تو حج ادا ہو جائے گا، اور فرض سے یقیناً آپ سبک دوش ہو جائیں گے۔ لیکن حج کی اس ظاہری شکل کے ہر ہر جز میں جو معنی پوشیدہ ہیں ان کو بھی اگر آپ اچھی طرح سمجھ لیں اور حج کے اعمال انجام دیتے وقت ہر عمل کی غرض و غایت کی طرف بھی متوجہ ہوں تو اس سے مقصدِ حج کی تکمیل ہو جائے گی اور آپ حج کے فوائد سے پوری طرح متمتع ہوں گے۔ اسی غرض کے لیے آج میں آپ کے سامنے حج کے اعمال میں سے ایک ایک عمل کے معنی سیدھے سادے اور مختصر طریقے سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔

احرام: اعمالِ حج میں سب سے پہلا عمل احرام ہے۔ باہر سے آنے والا کوئی حاجی میقات سے اُس وقت تک نہیں گزر سکتا جب تک وہ اپنا لباس اُتار کر احرام نہ باندھ لے اور اسی طرح مکہ معظمہ سے حج کی نیت کرنے والے کو بھی سب سے پہلے لباس تبدیل کر کے احرام باندھنا ہوتا ہے۔ یہ ایک انتہائی فقیرانہ لباس ہے جس میں آدمی بس ایک تہمد باندھ لیتا ہے، ایک چادر کندھوں پر ڈال لیتا ہے، اور سر ننگا رکھتا ہے۔ یہ اس عمل کی ظاہری صورت ہے۔ مگر غور سے دیکھیے کہ اس ذرا سے فعل میں کتنے گہرے معنی پوشیدہ ہیں۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ حج شروع کرنے سے پہلے ہمارے وہ سارے لفافے اُتروا دینا چاہتا ہے جو ہم نے اپنے اوپر ڈال رکھے ہیں، جن کے اندر ہم میں سے ہر ایک نے اپنے آپ کو اپنی اصل حقیقت سے کچھ نہ کچھ زائد بنا رکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم بندے ہو اور بندے سے بڑھ کر کچھ نہیں ہو۔ لہٰذا میرے دربار میں حاضر ہونا چاہتے ہو تو صرف بندے بن کر آؤ۔ تم کہیں کے بادشاہ یا صدرِ مملکت ہو تو ہوا کرو۔ کوئی جنرل ہو، وزیر ہو، رئیس ہو، یا جو کچھ بھی ہو، ہوتے رہو۔ میرے حضور میں تمھیں اپنی یہ ساری حیثیتیں ختم کر کے صرف ایک بندے کی حیثیت سے آنا ہوگا۔ اس طرح احرام کا یہ لباس ہر انسان کو بندگی کے مقام پر لا کر کھڑا کر دیتا ہے، اُس کی ہر شان امتیاز مٹا دیتا ہے، اور ایک بڑے سے بڑے شخص کو بھی ایک ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کی سطح پر لے آتا

ہے۔ آپ حالتِ احرام میں حاجیوں کے کسی مجمع پر نگاہ ڈال کر دیکھیں تو آپ کو کسی طرح یہ معلوم نہ ہو سکے گا کہ ان میں کون اونچا اور کون نیچا ہے۔ کون امیر اور کون غریب ہے، کون حاکم اور کون محکوم ہے۔ اللہ کے دربار میں سب ایک ہی طرح کے فقیر نظر آئیں گے۔

اونچ نیچ برابر کرنے کے ساتھ یہ احرام مسلمانوں کے درمیان تمام قومی، نسلی اور وطنی امتیازات بھی ختم کر دیتا ہے۔ اسلام کے ماننے والے دنیا کے ہر حصے سے چل کر آتے ہیں۔ مشرق، مغرب، شمال، جنوب، ہر طرف سے ملک ملک کے لوگ طرح طرح کے لباس پہنے ہوئے اپنے گھروں سے چلتے ہیں۔ مگر جونہی کہ وہ مرکزِ اسلام سے ایک خاص فاصلے پر پہنچتے ہیں، ان کو ایک میقات کی سرحد پر روک کر ان کے تمام قومی لباس اتروا دیئے جاتے ہیں اور سب کو ایک ہی طرح کا لباس پہنا دیا جاتا ہے تاکہ خداوندِ عالم کے دربار میں جب وہ حاضر ہوں تو انسان اور مسلمان کے سوا اور کچھ نہ ہوں۔ مسلمانوں کے اندر ملتِ واحدہ ہونے کا احساس پیدا کرنے کی اس سے زیادہ کارگر تدبیر شاید ہی کوئی دوسری ہو سکے۔ آپ کے سامنے لاکھوں حاجیوں کا ایک سیلِ رواں ہوتا ہے جس میں سینکڑوں قومیتوں کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ گزر رہے ہوتے ہیں۔ مگر یہ احرام کی برکت ہے کہ ہر دیکھنے والی نگاہ ان کو ایک ملت اور ایک ہی قوم کی حیثیت سے دیکھتی ہے اور ان کے سارے وطنی و نسلی امتیازات دب کر رہ جاتے ہیں۔

پھر یہ احرام آدمی کو حیوانیت سے دور اور ملائکہ کے مقام سے قریب کر دیتا ہے۔ اس حالت میں وہ کوئی جوں تک نہیں مار سکتا۔ کوئی بال تک نہیں اکھاڑ سکتا۔ کسی جانور کا شکار خود کرنا تو درکنار دوسرے کو کسی قسم کی مدد بھی شکار میں نہیں دے سکتا۔ اپنے جسم کی زینت و آرائش بھی اس کے لیے جائز نہیں رہتی۔ اس کی اپنی بیوی بھی اس کے لیے حرام ہو جاتی ہے جو عام حالات میں اس کے لیے حلال ہے، حتیٰ کہ وہ اس کی طرف کسی شہوانی میلان تک کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے فحش گوئی، بدکلامی، لڑائی جھگڑا، سب کچھ ممنوع ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے خادم کو بھی ڈانٹنے کا مجاز نہیں رہتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ احرام باندھتے ہی آدمی اللہ کا فقیر بن گیا اور اس نے تمام خواہشاتِ نفس کو تیاگ دیا۔

اب دنیا کی ہر چیز کو اس کی طرف سے امن و سلامتی کا پیغام ہے۔ اب کسی کو اس سے ضرر کا اندیشہ نہیں اب وہ کسی کے لیے بھی جبار و قہار اور ظالم نہیں رہا۔ اب وہ دنیا کی لذتوں سے کنارہ کش ہونے اور کبریائی کا ہر شائبہ اپنے نفس سے نکال دینے کے بعد بس ایک بندۂ عاجز ہے جو اپنے خدا کے حضور اپنی نیازمندی پیش کرنے کے لیے جا رہا ہے۔

حضرات یہ ہے احرام کی اصل روح۔ آپ جب غسل یا وضو کرکے احرام باندھتے ہیں اور اُن قواعد کی پابندی کرتے ہیں جو حالتِ احرام کے لیے مقرر کیے گئے ہیں، تو اس سے عمل کی صرف ظاہری شکل قائم ہوتی ہے۔ یہ شکل بناتے ہوئے اگر آپ کا ذہن اس تصور سے خالی ہو کہ یہ شکل آپ نے کیوں بنائی ہے تو یہ گویا ایک جسم ہوگا جس میں جان نہ ہو۔ جان اس میں اُسی وقت پڑے گی جب آپ پورے شعور اور ارادے کے ساتھ اپنے اندر وہ باطنی کیفیات بھی پیدا کر لیں جو درحقیقت احرام سے مقصود ہیں۔ قانون کی نگاہ میں تو ہر شخص مُحرِم ہے جس نے احرام کی پابندیوں میں سے کسی کو نہ توڑا ہو۔ مگر خدا کی نگاہ میں اصل مُحرِم وہی ہے جو احرام باندھتے ہی فی الواقع ایک فقیر اور ایک بندۂ عاجز بن کر رہ گیا ہو، جس نے اپنے دماغ سے کبریائی کی ہوا نکال دی ہو، جس نے قومی و نسلی تعصبات کو بھی اپنے ذہن سے نکال باہر کیا ہو، جو خلقِ خدا کے لیے سراپا رحم اور خیرِ مجسم بن گیا ہو، اور جس نے حیاتِ دنیا کی زینتوں سے مُنہ موڑ کر کم از کم یہ چند دن تو صرف اپنے رب سے لَو لگانے کے لیے خاص کر لیے ہوں۔

تلبیہ احرام باندھنے کے بعد آپ تلبیہ شروع کر دیتے ہیں جس کے الفاظ یہ ہیں:

لَبَّیْکَ، اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ، لَبَّیْکَ لَاشَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ، اِنَّ الْحَمْدَ وَ النِّعْمَۃَ لَکَ وَالْمُلْکَ، لَاشَرِیْکَ لَکَ۔

"میں حاضر ہوں، میرے اللہ میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں، یقیناً ساری تعریف تیرے ہی لیے ہے، سارے احسانات تیرے ہی ہیں، بادشاہی سراسر تیری ہے، تیرا کوئی شریک نہیں"

ان الفاظ پر غور کیجیے۔ ان کے اندر خود یہ معنی پوشیدہ ہیں کہ غلام کو اس کے آقا نے طلب کیا ہے اور غلام اس کے جواب میں لبیک لبیک کہتا ہوا اور اپنے مالک کی تعریف کے گن گاتا ہوا دوڑا چلا جا رہا ہے۔ بیت اللہ کی طرف طلبی ہوئی، اس نے عرض کیا میں حاضر۔ عرفات بلایا گیا، اس نے کہا میں حاضر۔ مزدلفہ طلب کیا گیا، اس نے کہا میں حاضر۔ منیٰ طلب کیا گیا، اس نے کہا میں حاضر۔ اس ساری دوڑ دھوپ کے دوران میں یہ الفاظ آپ زبان سے کہتے رہیں تو قانون کا تقاضا پورا ہو جائیگا مگر اس تلبیہ کی اصل روح یہ ہے کہ ان الفاظ کو زبان سے ادا کرتے ہوئے آپ اپنے دل کی گہرائیوں میں فی الواقع یہ محسوس کریں کہ آپ اللہ کے بندے اور غلام ہیں، اس کی طرف سے آپ کی طلبی ہوئی ہے، اور جہاں جہاں حاضر ہونے کے لیے طلبی ہوتی جا رہی ہے وہاں آپ لبیک لبیک کہتے ہوئے دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ اس لبیک میں ایک نشہ ہے جو لازماً ہر اس بندۂ حق پر طاری ہو جائے گا جسے یہ احساس ہو کہ خداوندِ عالم کی طرف سے اس جیسی ناچیز ہستی کی طلبی ہو رہی ہے۔

یہ نصیب ؟ اللہ اکبر، لوٹنے کی جائے ہے

حرم کی حاضری | باہر سے آنے والے ہر حاجی کی فطری خواہش یہ ہوتی ہے، اور یہی اس کو کرنا بھی چاہیے کہ مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد جلدی سے جلدی حرم میں حاضر ہو۔ پھر جب وہ حرم میں داخل ہوتا ہے اور بیت اللہ پر اس کی نظر پڑتی ہے تو اس کے دل پر ایک ہیبت طاری ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے جلال کا کرشمہ ہے، اور اس کا دل بے اختیار خانۂ کعبہ کی طرف کھنچتا ہے جو اللہ جل شانہٗ کی محبت کا فطری تقاضا ہے۔ اس موقع پر اسے دل اور زبان سے اللہ اکبر، لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر کہنا چاہیے اور پورے شعور کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرنی چاہیے:

اَللّٰھُمَّ زِدْ ھٰذَا الْبَیْتَ تَعْظِیْمًا وَّتَشْرِیْفًا وَّتَکْرِیْمًا وَّمَھَابَۃً وَّبِرًّا

"خدایا، اس گھر کو زیادہ سے زیادہ عظمت و شرف اور بزرگی اور دبدبہ عطا فرما،

اور اسے زیادہ سے زیادہ نیکیوں کا مرکز بنا دے۔"

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ، وَمِنْكَ السَّلَامُ، فَحَيِّنَا رَبَّنَا بِالسَّلَامِ

"خدایا تو خود ہر عیب و نقص سے پاک ہے، اور عیوب و آفات سے سلامتی جس کو بھی نصیب ہوتی ہے تیری ہی طرف سے نصیب ہوتی ہے، لہٰذا اے پروردگار ہمیں جسم و روح کی سلامتی کے ساتھ جینے کی توفیق عطا فرما۔"

ضروری نہیں ہے کہ یہ دعائیں آپ عربی زبان ہی میں مانگیں۔ اصل چیز ان الفاظ کو زبان سے ادا کرنا نہیں ہے، بلکہ اُس مضمون کی دُعا اللہ سے مانگنا ہے جو ان فقروں میں بیان کیا گیا ہے۔ آپ کو عربی الفاظ یاد کرنے اور پڑھنے میں دقّت ہو تو آپ اسی مضمون کی دُعا اپنی زبان میں بھی مانگ سکتے ہیں۔

طواف | حرم میں پہنچنے کے بعد ہر حاجی کو طواف کرنا ہوتا ہے۔ اگر احرام باندھتے وقت اس نے تمتع یا قِران کی نیت کی ہو تو وہ عمرے کا طواف کرتا ہے[1]، اور اگر افراد (یعنی صرف حج) کی نیت کی ہو تو طوافِ قدوم کرتا ہے۔ پھر یوم النحر کو اسے طوافِ افاضہ اور مکہ چھوڑتے وقت طوافِ وداع بھی کرنا ہوتا ہے۔ اور ان ضروری طوافوں کے علاوہ بھی یہ ایک ایسی نفلی عبادت ہے جس کا موقع باہر سے آنے والوں کو صرف زمانہ قیام مکہ ہی میں نصیب ہو سکتا ہے، اس لیے اس موقع سے جتنا بھی فائدہ اٹھایا جا سکے اٹھانا چاہیے۔

یہ طواف کیا ہے؟ یہ انسان کے اس فطری جذبے کا اظہار ہے کہ جس ہستی کو وہ اپنا منعم و محسن سمجھتا ہے اور اپنا معبود مانتا ہے اس پر اپنے آپ کو فدا کرے، اس کے گرد گھومے اور صدقے اور قربان ہو۔ اللہ تعالیٰ بذاتِ خود اس سے بالاتر ہے کہ ہم اسے پا سکیں اور اس کے گرد گھوم سکیں۔ اُس نے ہمارے اِس جذبے کی تسکین کے لیے اِس خانہ کعبہ کو اپنا گھر قرار دیا ہے اور ہمیں ہدایت کی ہے کہ مجھ پہ فدا ہونے کی جو خواہش تمہارے دل میں ہے اسے میرے اِس گھر کا طواف کر کے پورا کر لو۔ پس جب آپ اس گھر کا طواف کریں تو عشق کے جذبے سے سرشار ہو کر اس طرح طواف کیجیے جیسے ایک عاشق اپنے محبوبِ حقیقی کے صدقے ہو رہا ہے۔

---

[1] تمتع یہ ہے کہ آدمی عمرہ کر کے احرام کھول دے اور پھر حج کا وقت آنے پر نئے سرے سے احرام باندھے۔ اور قِران یہ ہے کہ ایک ہی احرام میں عمرہ اور حج دونوں کرے۔

ہر طواف کی ابتدا حجرِ اسود کے بوسے یا استلام سے ہوتی ہے۔ یہ درحقیقت ایک پتھر کا بوسہ نہیں ہے بلکہ محبوب کے سنگِ آستاں کا بوسہ ہے۔

اسی طرح طواف اور مقام ابراہیم کی دو رکعتوں سے فارغ ہونے کے بعد مُلتزَم سے چمٹ کر جو دعائیں مانگی جاتی ہیں وہ بھی یہی سمجھتے ہوتے مانگنی چاہییں کہ یہ ہمارے مالک کے گھر کی چوکھٹ ہے۔ مالک خود تو اس سے بالاتر ہے کہ ہم اس کا دامن تھام سکیں۔ ہماری نارسائی پر ترس کھا کر اُس نے یہ گھر ہمارے لیے بنا دیا ہے تاکہ اُس کے دامن سے لپٹ کر اپنی آرزوئیں پیش کرنے کی جو تمنا ہمارے دل میں ہے اُسے ہم اُس کے گھر کی چوکھٹ سے لپٹ کر پورا کر لیں۔

طواف کے دوران میں پڑھنے کے لیے جو لمبی چوڑی دعائیں بعض لوگوں نے لکھی ہیں، اُن کا یاد کرنا اور پڑھنا کچھ ضروری نہیں ہے۔ اور یہ طریقہ تو بالکل ہی فضول ہے کہ ایک معلّم آگے آگے دعا پڑھتا جا رہا ہے اور حاجیوں کی ایک ٹولی کی ٹولی اس کی غلط سلط نقل اتارتی جا رہی ہے۔ طواف کے لیے اِن دعاؤں کو شریعت نے ہرگز لازم نہیں کیا ہے، اور نہ اِس بے معنی طریقے سے ان کو ادا کرنے کا کوئی فائدہ ہے۔ بس یہ کافی ہے کہ آپ طواف شروع کرتے وقت حجرِ اسود کے سامنے کھڑے ہو کر نماز کی طرح ہاتھ اٹھائیں اور بِسۡمِ اللہِ اَللہُ اَکۡبَر، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ وَلِلّٰہِ الۡحَمۡد کہہ کر طواف شروع کر دیں، پھر دورانِ طواف میں اللہ کا ذکر کرتے چلے جائیں اور اس سے دعا مانگتے جائیں۔ ذکر کے لیے سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الٰہ الا اللہ اور اللہ اکبر کے الفاظ کافی ہیں کسی اور چیز کی حاجت نہیں۔ دُعا جو کچھ بھی آپ کے دل سے نکلے اور جس زبان میں بھی آپ مانگ سکیں، مانگتے رہیں۔

حجرِ اسود کا بوسہ دینے کے لیے جو ہجوم اور دھکا پیل لوگ کرتے ہیں یہ ایک نا روا فعل ہے، بلکہ اس میں ایک دوسرے کی جو سخت مزاحمت کی جاتی ہے وہ توجہ کو ضائع کرنے والی حرکت ہے۔ خصوصاً عورتوں کا اس دھکا پیل میں گھُسنا تو بالکل ہی ناجائز ہے۔ شریعت نے آپ پر یہ لازم نہیں کیا ہے کہ آپ ضرور حجرِ اسود کو بوسہ ہی دیں۔ یہ کام اگر مزاحمت کے بغیر نہ ہو سکتا ہو

تو ہر چکر کے خاتمہ پر حجرِ اسود کے سامنے پہنچ کر اُس کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرنا اور اپنے ہاتھ ہی کو چُوم لینا شرعًا بالکل کافی ہے۔

جس طواف کے بعد سعی کرنی ہو اس میں اضطباع اور رمل بھی کیا جاتا ہے۔ اضطباع یہ ہے کہ احرام کی چادر کو سیدھے ہاتھ کے نیچے سے نکال کر بائیں کندھے پر ڈال لیا جائے اور دایاں شانہ کھلا رکھا جائے۔ اور رمل یہ ہے کہ پہلے تین طواف شانے ہلا ہلا کر چھوٹے چھوٹے قدم ڈالتے ہوئے ذرا تیزی کے ساتھ کیے جائیں۔ یہ دراصل اِس واقعے کی یادگار ہے کہ صلح حدیبیہ کی قرارداد کے مطابق جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے ساتھ عمرہ کرنے کے لیے مکہ معظمہ تشریف لائے تھے تو کفارِ مکہ نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ مدینے کی آب و ہوا نے مسلمانوں کو کمزور کر دیا ہے۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حکم دیا تھا کہ پہلے تین طوافوں میں اضطباع اور رمل کریں تاکہ کفار کے سامنے اہلِ اسلام کی طاقت کا مظاہرہ ہو۔ اسی یادگار کو آج تک باقی رکھا گیا ہے۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ بندے کا اکڑ کر چلنا ویسے تو اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے، مگر جب اُس کے دشمنوں کے سامنے اسلام کی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لیے یہ چال اختیار کی جائے تو پھر یہی چال اللہ کو محبوب ہو جاتی ہے۔

مقامِ ابراہیم | طواف سے فارغ ہونے کے بعد آپ مقامِ ابراہیم پر پہنچتے ہیں اور وہاں دو رکعت نماز ادا کرتے ہیں۔ اس مقام پر جو پتھر رکھا ہے یہی پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی دیواریں اٹھائی تھیں، پھر اسی پر کھڑے ہو کر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس ویران و سنسان مقام پر تمام خلق کو حج کے لیے پکارا تھا اور اسی پکار کے جواب میں آج آپ لبیک لبیک کہتے ہوئے یہاں آتے ہیں۔ پہلے یہ پتھر خانہ کعبہ کی دیوار سے متصل رکھا ہوا تھا۔ بعد میں اسے موجودہ مقام پر رکھ دیا گیا۔ اس مقام کے متعلق اللہ کا حکم ہے کہ اسے نماز کی جگہ بنا لو۔ وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى۔ طوافِ کعبہ کے بعد یہ دو رکعتیں اسی فرمانِ خداوندی کی تعمیل میں پڑھی جاتی ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی آپ کے علم میں رہنی چاہیے کہ تمام دنیا کے لیے قبلہ مسجد حرام ہے، اور مسجد حرام میں نماز پڑھنے والوں کے لیے قبلہ خانۂ کعبہ ہے، اور مسجدِ حرام کی نمازِ باجماعت کے لیے امام کا قبلہ وہ مقام ہے جہاں سے حضرت ابراہیمؑ نے دنیا کو حج کے لیے پکارا تھا۔ حضرت ابراہیم خود بھی اسی مقام پر کھڑے ہو کر کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ اور آج بھی حرم کی نمازِ باجماعت کا امام اسی جگہ کھڑا ہوتا ہے

سعی بین الصفا والمروہ

مقامِ ابراہیم پر دو رکعت نماز ادا کرنے اور مُلتزم پر دعا کرنے کے بعد آپ زمزم پر آتے ہیں اور اس کا پانی پیتے ہیں۔ پھر عمرے کی تکمیل کے لیے صفا اور مروہ کے درمیان سات مرتبہ سعی کرتے ہیں۔ یہ سب کام آپ غفلت و بے خبری کے ساتھ نہ کریں بلکہ اپنے دل میں سوچیں کہ یہ زمزم کیا جگہ ہے جہاں آپ کھڑے ہیں، یہ پانی کیسا ہے جسے آپ پی رہے ہیں، یہ صفا کیسی پہاڑی ہے جس سے آپ سعی کی ابتدا کرتے ہیں اور یہ سات چکر کیسے ہیں جو آپ صفا اور مروہ کے درمیان لگاتے ہیں۔

حضرات! ان میں سے ہر مقام اپنی ایک تاریخ رکھتا ہے اور اس تاریخ کے اندر ایک درسِ عبرت ہے۔ آج بیت اللہ اور زمزم اور مقامِ ابراہیم جہاں واقع ہیں، ٹھیک یہی جگہ ہے جہاں آج سے چار ہزار برس پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی حضرت ہاجرہ، اور اپنے شیر خوار بچے حضرت اسماعیل کو صرف ایک مشکیزہ پانی اور ایک تھیلا کھجوروں کا دے کر بالکل یک و تنہا چھوڑ گئے تھے۔ یہاں کوئی پانی نہ تھا۔ کوئی غذا کا سامان نہ تھا۔ دُور دُور کوئی بستی نہ تھی۔ اور بظاہر یہ دونوں ماں بچے اس سنسان وادی میں قطعی بے سہارا تھے۔ حضرت ابراہیم جب انہیں چھوڑ کر واپس جانے لگے تو حضرت ہاجرہ ان کے پیچھے چلیں اور بار بار پوچھتی تھیں کہ آپ ہمیں کہاں چھوڑے جا رہے ہیں، مگر وہ خاموش چلے جا رہے تھے۔ آخر حضرت ہاجرہ نے پوچھا کیا یہ کام آپ اللہ کے حکم سے کر رہے ہیں؟ انہوں نے فرمایا ہاں۔ اس پر حضرت ہاجرہ نے کہا، اگر یہ بات ہے تو اللہ یقیناً ہمیں ضائع نہ ہونے دے گا۔ پھر وہ پورے اطمینان کے ساتھ اللہ کے بھروسے پر اپنے بچے کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ حضرت ابراہیم جب اس

وادی سے نکلنے لگے تو پلٹ کر انہوں نے وادی کی طرف رُخ کیا اور اللہ سے دعا مانگی کہ:

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـــِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ - (ابراہیم: ۳۷)

"اے پروردگار! میں نے اپنی نسل کا ایک حصہ ایک بے آب و گیاہ وادی میں تیرے محترم گھر کے قریب لا بسایا ہے۔ اے پروردگار، یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ یہ یہاں نماز قائم کریں پس تو ایسا کر کہ لوگوں کے دل ان کی طرف کھچیں اور ان کو پھلوں سے رزق دے تاکہ یہ شکر گزار رہیں"

دیکھیے، کیا شانِ تسلیم و رضا اور کیا شانِ توکل علی اللہ تھی اُس شوہر اور باپ کی جس نے اللہ رب العلمین کا اشارہ پاتے ہی اپنی بیوی اور بچے کو ٹھنڈے دل سے اس بے آب و گیاہ وادی میں لاکر چھوڑ دیا۔ اور کس درجے کا یقین و اعتماد اپنے خدا پر تھا اُس ناتون کو جو یہ معلوم ہو جانے کے بعد بالکل مطمئن ہو گئی کہ اسے اور اس کے ننھے بچے کو اللہ کے حکم سے یہاں یکہ و تنہا چھوڑا جا رہا ہے۔

جب پانی اور کھجوروں کا ذخیرہ ختم ہو گیا اور دونوں ماں بچے بھوک پیاس سے تڑپنے لگے تو حضرت ہاجرہ اس زمزم کے مقام پر بچے کو لٹا کر صفا کی پہاڑی پر پہنچیں تاکہ چاروں طرف نگاہ ڈال کر دیکھیں کہ کہیں کوئی مدد کرنے والا ہے؟ پھر صفا سے اُتر کر مروہ کی طرف دوڑیں اور اس پر چڑھ کر پھر انہوں نے چاروں طرف دیکھا کہ شاید کوئی مدد کرنے والا نظر آئے۔ اس طرح ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان وہ مسلسل سات دفعہ دوڑیں۔ آخری مرتبہ جب وہ مروہ پر تھیں تو انہوں نے ایک آواز سُنی۔ یقین نہ آیا کہ یہ واقعی کسی کی آواز ہے۔ پھر کان لگا کر سنا اور وہی آواز آئی۔ زمزم کی طرف دیکھا جہاں بچے کو لٹا کر گئی تھیں تو ایک شخص نظر آیا جو دراصل اللہ کا فرشتہ تھا۔ اُس نے زمین پر پاؤں مارا اور دیکھا یک ایک چشمہ نکل آیا۔ پھر اس نے حضرت ہاجرہ سے

کہا، اطمینان رکھو، اللہ تمہیں ضائع کرنے والا نہیں ہے، یہاں اللہ کا گھر بننے والا ہے جسے تمہارا یہ لڑکا اور اس کا باپ تعمیر کرے گا۔

حضرات، اسی واقعہ کی یادگار یہ سعی بین الصفا والمروہ ہے جو آج عمرے اور حج میں کی جاتی ہے۔ حضرت ہاجرہ نے صفا سے سعی کی ابتدا کی تھی، اس لیے ہماری سعی بھی اسی سے شروع ہوتی ہے۔ انہوں نے سات چکر لگائے تھے، اس لیے ہم بھی سات چکر لگاتے ہیں۔ انہوں نے سعی کے بعد آکر پانی پیا تھا، کیونکہ اس سے پہلے یہاں پانی موجود نہ تھا۔ ہم سعی سے پہلے اللہ تعالیٰ کے معجزے سے پیدا ہونے والا یہ پانی پیتے ہیں، کیونکہ اب وہ موجود ہے۔ یہ سارے کام جو حضرت ہاجرہ کے اُس فعل کی نقل کے طور پر کیے جاتے ہیں، ان کی اصل روح یہ ہے کہ ہم اپنے اندر وہی تسلیم و رضا، وہی توکل علی اللہ اور وہی یقین و اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کریں جس کا حیرت انگیز مظاہرہ حضرت ابراہیم اور حضرت ہاجرہ نے کیا تھا۔ ہمیں جب یہ معلوم ہو جائے کہ کسی کام کا حکم اللہ جل شانہٗ کی طرف سے ہے تو پھر کوئی خطرہ اور کوئی اندیشہ ہمیں اس کی تعمیل سے باز نہ رکھ سکے۔ ہم پورے یقین کے ساتھ اس بھروسے پر چھلانگ لگا دیں کہ جس خدا نے اس ظاہری خطرے میں کود جانے کا ہمیں حکم دیا ہے وہ ہمیں ضائع کرنے والا نہیں ہے۔ ہماری بھلائی اُسی کام میں ہے جس کا اُس نے حکم دیا ہے۔ یہ درس جس نے بھی یہاں سے حاصل کر لیا وہ آبِ زمزم پینے اور صفا و مروہ کے درمیان دوڑنے کے سارے روحانی فوائد لوٹ لے گیا۔

یہ بات بھی جان لیجیے کہ ان مناسک کو ادا کرتے ہوئے بھی اللہ کا ذکر اور اس سے دعا کا سلسلہ برابر جاری رہنا چاہیے۔ آبِ زمزم کا پانی پییں تو اللہ سے دعا کریں کہ

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ رِزْقًا وَّاسِعًا، وَعِلْمًا نَّافِعًا، وَّشِفَاءً مِّنْ کُلِّ دَاءٍ

"خدایا، میں تجھ سے فراخ روزی، نفع بخش علم، اور ہر بیماری سے شفا مانگتا ہوں"

صفا پر چڑھیں تو کعبے کی طرف رخ کر کے کہیں:

اللہ اکبر، اللہ اکبر، اللہ اکبر وللہ الحمد۔ اللہ اکبر علی ما ھدانا و الحمد للہ علی ما اولانا۔ لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ، لہ الملک ولہ الحمد، یحیی ویمیت، بیدہ الخیر وھو علی کل شیئ قدیر۔ لا الہ الا اللہ وحدہ، لاشریک لہ، انجز وعدہ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہ۔ لا الہ الا اللہ ولا نعبد الا ایاہ، مخلصین لہ الدین ولو کرہ الکافرون۔

"اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے اور اسی کے لیے ساری تعریف ہے۔ ہم اللہ کی بڑائی کرتے ہیں اِس شکر میں کہ اُس نے ہمیں ہدایت بخشی اور اُس کی تعریف کرتے ہیں اُن احسانات پر جو اس نے ہم پر کیے ہیں۔ اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کے لیے حمد ہے، وہی جلاتا اور مارتا ہے، اسی کے اختیار میں بھلائی ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ کوئی معبود اکیلے اللہ کے سوا نہیں ہے، کوئی اس کا شریک نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا، اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد کی اور سارے جتھوں کو اسی اکیلے نے شکست دے دی۔ کوئی معبود اللہ کے سوا نہیں، ہم اُسی کی بندگی کرتے ہیں اپنے دین کو اُس کے لیے خالص کرکے، خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو"۔ یہی کچھ آپ مروہ پر بھی کہیں، اور صفا و مروہ کے درمیان چلتے ہوئے یہ دعا کرتے جائیں کہ

رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَتَجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمُ، اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعَزُّ الْاَكْرَمُ

"اے رب، بخش دے اور رحم کر، ہمارے اُن سارے قصوروں سے درگزر فرما جو تیرے علم میں ہیں، تو سب پر غالب اور بڑا کریم ہے"۔

حج آٹھویں ذی الحجہ کی صبح کو تمام حاجی مکۂ معظمہ سے حج کے لیے نکلتے ہیں، اور جن لوگوں نے تمتع کرتے ہوئے عمرے کے بعد احرام کھول لیا تھا وہ بھی نئے سرے سے احرام باندھ لیتے ہیں۔ اب اصل حج شروع ہوتا ہے۔ یہ لاکھوں احرام بند حاجی بیک وقت مکے سے چل کر لبیک لبیک کہتے ہوئے ۸ ذی الحج کو منیٰ جا اُترتے ہیں۔ پھر یہی مجمع عظیم ۹ ذی الحج کی صبح کو بیک وقت لبیک لبیک کہتا ہوا چلتا ہے اور حدودِ حرم سے باہر جا کر عرفات کے میدان میں پڑاؤ ڈال دیتا ہے۔ پھر اُسی روز شام کو یہ پورا مجمع اٹھتا ہے اور لبیک لبیک پکارتا ہوا مزدلفہ جا اترتا ہے۔ پھر دس ذی الحج کو طلوعِ آفتاب سے پہلے پہلے حاجیوں کا یہ سیلاب لبیک کہتا ہوا اٹھتا ہے اور منیٰ واپس پہنچ جاتا ہے۔ پھر یہ سب لوگ لبیک کہتے ہوئے جمرۂ عقبہ کی طرف چلتے ہیں اور اس پر سات کنکریاں مارتے ہیں۔ پھر یہ لوگ منیٰ ہی میں قربانی کرتے ہیں۔ پھر سب سر کے بال منڈواتے یا ترشواتے ہیں۔ پھر جوق در جوق مکۂ معظمہ پہنچ کر طواف اور سعی کرتے ہیں۔ پھر منیٰ واپس ہو کر دو دن یا تین دن قیام کرتے ہیں اور ان ایام میں ہر روز تینوں جمروں پر رمی کرتے ہیں۔ یہی اعمال ہیں جن کا نام حج ہے۔

جو لوگ عبادت کے معنی اور حج کی حقیقت کو نہیں سمجھتے وہ حیران ہو کر سوچنے لگتے ہیں کہ آخر یہ کیسی دوڑ دھوپ ہے جس کے لیے دنیا بھر سے کھینچ کر لاکھوں آدمیوں کو بلایا جاتا ہے؟ اور یہ کیا عبادت ہوئی کہ مکہ سے اُٹھے اور منیٰ پہنچ گئے، وہاں سے اُٹھے اور عرفات جا ٹھیرے پھر چلے اور مزدلفہ میں رات گزار دی، پھر منیٰ پہنچے اور وہاں ایک پتھر کو کنکریاں مار دیں؟ لیکن آپ ذرا سمجھنے کی کوشش کریں تو آپ پر یہ حقیقت کھل جائے گی کہ اس ساری دوڑ دھوپ میں جو زحمت آدمی کو پیش آتی ہے، جو تکلیفیں اس کو اٹھانی پڑتی ہیں، جس مشقت اور بے آرامی سے اس کو سابقہ درپیش ہوتا ہے، جس طرح وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بے ٹھکانے ہوتا چلا جاتا ہے، اللہ کی راہ میں یہی سب کچھ برداشت کرنا تو اصل عبادت ہے۔ عمرے میں طواف و سعی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا، کیونکہ وہ فرداً فرداً کیا جاتا ہے۔ ایک فرد کے لیے

ایک دن عرفات جا ٹھیرنا، ایک رات مزدلفہ میں گزار دینا اور دو چار روز منیٰ میں ٹھیر جانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اسی لیے عمرہ کرنے والے کو ان کاموں میں سے کوئی کام بھی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا لیکن حج میں لاکھوں آدمیوں کو بیک وقت یہ دوڑ دھوپ کرنی ہوتی ہے جس سے کوئی بڑے سے بڑا صاحب ثروت آدمی بھی زحمتیں اٹھاتے اور آسائشوں سے محروم ہوتے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ حج کی اجتماعی عبادت میں طواف و سعی سے زائد یہ مناسک رکھے گئے ہیں۔ اس سے مقصود ہر بندۂ مومن میں یہ کیفیت پیدا کرنا ہے کہ وہ اللہ کی رضا کے لیے ہر آسائش سے دستکش ہونے اور اس کی راہ میں ہر زحمت اٹھانے کے لیے تیار ہو جائے۔ یہی اللہ پر ایمان لانے کا تقاضا ہے۔ یہی بندگی کے معنی ہیں۔ اور یہی اس عبادت کی روح ہے۔ اس عبادت کے دوران میں جو شخص ان ساری تکلیفوں کو پورے اطمینان اور قلب و روح کی پوری مسرت کے ساتھ قبول کرتا ہے، اور اپنے ساتھ کے حاجیوں کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں کرتا، بلکہ سخت کشمکش کے مواقع پر بھی صبر و ضبط سے کام لیتا ہے اور خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچاتا ہے وہ حج کا ثواب لوٹ لیتا ہے۔ اور اس کے برعکس جو شخص اپنی ہر بے آرامی پر چیں بجبیں ہوتا ہے، ہر زحمت پر کبیدہ خاطر ہوتا ہے، اور ساتھ کے حاجیوں سے اپنے آرام کی خاطر مزاحمت کرتا اور لڑتا جھگڑتا ہے وہ حج کے ثواب کو ضائع کر دیتا ہے۔ اس بے چارے کے حصے میں خالص مشقت ہی رہ جاتی ہے۔ اجر ہوا میں اُڑ جاتا ہے۔

یہ بات بھی ملحوظ رکھیے کہ حج کے ان اعمال کو ادا کرتے وقت آپ خواہ کچھ بھی نہ پڑھیں اور وقت پر نماز ادا کر دینے کے سوا کوئی دوسرا عمل نہ کریں، تب بھی حج پورا ہو جائے گا اور بجائے خود حج کا جو ثواب ہے وہ آپ کو مل جائے گا۔ مگر بدقسمت ہے وہ شخص جسے اللہ سے تقرب حاصل کرنے کا یہ نادر موقع نصیب ہو اور وہ زیادہ سے زیادہ قرب حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے۔ مکہ معظمہ سے نکلنے کے بعد یوم النحر کی پہلی رمی تک بہترین ذکر یہ ہے کہ آدمی زیادہ

سے زیادہ تلبیہ کرے اور اس شعور کے ساتھ کرے کہ میرا مولیٰ اب منیٰ بلا رہا ہے تو میں حاضر ہوں، اب عرفات بلا رہا ہے تو اس کے لیے بھی حاضر ہوں، اب مزدلفہ بلا رہا ہے تو اس کے لیے بھی حاضر، اور اب رمی کے لیے منیٰ طلب کر رہا ہے تو اس کے لیے بھی حاضر۔ ہر مرتبہ لبیک کہتے ہوئے آپ محسوس کریں کہ رب العٰلمین کی طرف سے آپ کی طلبی ہو رہی ہے اور آپ اس کے جواب میں کہہ رہے ہیں کہ میں حاضر ہوں۔ اس احساس کے ساتھ جب آپ بار بار لبیک کہیں گے تو انشاء اللہ آپ کے دل میں ذوق و شوق کی وہ کیفیت پیدا ہو گی اور روح اس کے اندر وہ لذت پائے گی جس کے مقابلے میں ہر لذت ہیچ ہو جائے گی۔

تلبیہ کے علاوہ بیچ بیچ میں کثرت سے اللہ کی حمد اور تکبیر و تہلیل کرتے جائیے۔ کثرت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجیے۔ کثرت سے اپنے حق میں، اپنے والدین کے حق میں، اور سب مومنین و مومنات کے حق میں دعائے مغفرت کیجیے۔ اور خاص طور پر وقوفِ عرفہ کے آخری وقت میں اور قیامِ مزدلفہ کی رات میں تو اپنا زیادہ سے زیادہ وقت اللہ کے ذکر اور دعا و استغفار میں صرف کر دیجیے۔ پھر ایامِ تشریق میں منیٰ کے قیام کا زمانہ فضول مشاغل میں نہ ضائع کیجیے، بلکہ اسے خیر اور صلاح کی تبلیغ میں، دنیا بھر سے آئے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ روابط پیدا کرنے میں، اور اعلائے کلمۃ الحق کی فکر و سعی میں صرف کیجیے تاکہ حج کے روحانی و اخلاقی فوائد کا کوئی پہلو آپ سے چھوٹنے نہ پائے۔

یہ ہیں حج کے معنی اور یہ ہے اس کو ادا کرنے کا صحیح طریقہ۔ میری دعا ہے کہ اللہ مجھے اور آپ سب کو یہ فریضہ ٹھیک ٹھیک اس کی اصل روح کے ساتھ ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

ایران میں دین اور لادینی کی کشمکش

خلیل حامدی

ایران میں ایک سال سے متواتر خونیں ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے ——— مُلحد اور لادین عنصر تمام اخلاقی اور انسانی اصولوں کو پسِ پشت ڈال کر دین کے استیصال اور دین پسندوں کو تہ تیغ کرنے پر اُترا ہوا ہے۔ نشۂ اقتدار نے اُس کے فہم وفکر کو اس حد تک ماؤف کر دیا ہے کہ اپنی گھٹیا خواہشات کی خاطر ملک کے ۲ کروڑ باشندوں سے اُس نے جنگ ٹھان رکھی ہے۔ دین پسندوں کو "قدامت پرستی" اور "تاریک خیالی" کا طعنہ دینے والے یہ حضرات سینکڑوں بہی خواہانِ وطن کا خون بہا کر اور ہزاروں کو جیلوں میں ظلم وتشدد کا نشانہ بنا کر بھی "ترقی پسندی" اور "روشن خیالی" کے ٹھیکیدار بنے بیٹھے ہیں۔ یہ پورے ملک کا اخلاقی دیوالیہ نکال دیتے ہیں، ۲ کروڑ افراد کی شہری آزادیوں کو غصب کر لیتے ہیں، اپنے تمام عہد وپیمان کے پُرزے پُرزے اُڑا دیتے ہیں اور ملک کے دستورِ اساسی میں ناجائز تصرف کرتے ہیں اور جب ان کو یہ ہزار اخلاص وخیر خواہی ٹوکا جاتا ہے تو عقل کے ناخن لینے کے بجائے کف بدہن ہو جاتے ہیں اور ٹوکنے والوں پر فیلِ بے زنجیر کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں۔ نہ عورتوں کی عزت وناموس کا انہیں لحاظ ہوتا ہے اور نہ معصوم بچوں اور سفید ریش بوڑھوں کے لیے ان کے دل میں رحم ورعایت۔

یہ خونیں ڈرامہ ایران میں پورے ایک سال سے کھیلا جا رہا ہے۔ اس ڈرامے کا سفاک کردار خوش ہے کہ وہ قتل بھی کرتا ہے تو چرچا نہیں ہوتا اور اس کا مظلوم مگر حق بجانب کردار بے آواز ہے، اس کی زبانیں مقفل ہیں۔ اُس کے قلم زیرِ حراست ہیں، اس کی ستم رسیدگی سے دنیا کو مطلع کرنے کے لیے کوئی خبر رساں ایجنسی تیار نہیں ہے۔ بلکہ تمام بیرونی خبر رساں ایجنسیاں، جو کلیتہً مخالفینِ اسلام اور زیادہ تر یہودیوں کے ہاتھ میں ہیں، دنیا کو اس کی اُلٹی ہی خبریں مہیا کر رہی ہیں۔ ہم آپ کو آئندہ صفحات میں اس

ڈرامے کی تفصیل سناتے ہیں۔ یہ درحقیقت ایران میں الحاد اور دین کی کشمکش کی داستان ہے جو علماء ایران و عراق کی ارسال کردہ مطبوعات سے اخذ کر کے یہاں درج کی جا رہی ہے۔

ایران کی موجودہ حالت اس خونیں ڈرامے کی تفصیلات معلوم کرنے سے پہلے چند باتیں نگاہ میں رہنی ضروری ہیں:

۱۔ ایران اقتصادی لحاظ سے بالکل تباہ ہو چکا ہے۔ اس کا تمام تر دارومدار خارجی امداد پر ہے۔ غربت، افلاس اور مفلوک الحالی ایرانی قوم کو زندہ درگور کر چکی ہے۔ ایران کے بڑے بڑے تجارتی ادارے اور اقتصادی منصوبے صرف چند لوگوں کی مٹھی میں ہیں، جن کی اکثریت یہودی ہے۔ یہودی سرمایہ دار اپنے سرمائے کے بل بوتے پر ایران کے کلیدی مناصب پر چھا رہے ہیں۔ ایک طرف یہ کاروبار پر اجارہ داری کی بدولت ایرانی عوام کے خون کا آخری قطرہ نچوڑ چکے ہیں اور دوسری طرف یہ بے پناہ اثر و نفوذ کی وجہ سے ایران میں اپنی جڑیں مضبوط کرتے جا رہے ہیں۔ اور ایران میں ان کو وہ مراعات حاصل ہیں جو خود اسرائیل میں یہودیوں کو حاصل نہیں ہیں۔ ان کے وسیع اثرات کا اندازہ صرف اس ایک مثال سے ہو سکتا ہے کہ ایران ریڈیو ایک یہودی کی ملکیت ہے۔ یہ شخص چند سال پیشتر معمولی تاجر تھا لیکن اب یہ ایران میں بیسیوں کمپنیوں کا مالک اور بیسیوں کا حصّہ دار ہے۔ سرکار دربار میں اسے غیر معمولی تقرّب حاصل ہے۔ درآمد و برآمد کی تمام کنجیاں اس کے ہاتھ میں ہیں۔

۲۔ اخلاقی لحاظ سے بھی ایران روز بروز انحطاط کی طرف چلا جا رہا ہے۔ عوام کے اخلاقی سرمایہ پر سب سے بڑا حملہ برسرِ اقتدار طبقہ کی طرف سے ہو رہا ہے۔ ایران کا شاہی خاندان اور طبقۂ امراء خود بھی اخلاقی لحاظ سے دیوالیہ ہو چکا ہے اور اپنی اخلاقی غلاظت سے پورے ملک کو بھی ملوث کر رہا ہے۔ اس کی تمام تر کوشش یہی ہے کہ قوم کی عورتوں میں بے حیائی اور نوجوانوں میں بدکرداری پھیلائی جائے۔ مگر عام ایرانی خاتون ابھی تک اپنی مذہبی اور تاریخی روایات کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ سیاسی اور ثقافتی مشغلوں سے اُسے دور کا واسطہ نہیں ہے۔ ایران کے حکمران اور سرمایہ دار جن عشرت کوشیوں میں غرق ہیں وہ اُن سے بیزار ہے۔ وہ عائلی مسائل و تنازعات میں بھی اپنے مذہب ہی کو مرجع سمجھتی ہے۔ اور

یہی چیز ایران کے حکمرانوں کے لیے سوہانِ روح بنی ہوئی ہے۔

۳- ایران کے ۲ کروڑ باشندے اپنی جہالت و غربت کے باوجود دین سے وابستگی ختم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کے دل و دماغ پر اپنے مذہبی پیشوا اور علماء قابض ہیں۔ ان کے مشائخ جس چیز کو اسلام کے منافی قرار دیتے ہیں اُسے کوئی طاقت اُن سے نہیں منوا سکتی۔ عوام کی اس "اندھی عقیدت" سے ملاحدہ سخت چیں بجبیں ہیں۔ اور اس اندھی عقیدت کو ختم کرنے کے لیے تین عناصر پوری طرح متحد ہیں: یہودی، کمیونسٹ، اور بہائی۔ اور چوتھا "خلیفہ ان کونسل" یہ متحدہ محاذ ایران سے دین کا نام و نشان مٹانے کے لیے پُوری طرح تُلا ہُوا ہے۔

۴- جیسا کہ پیراگراف نمبر ۱ میں عرض کیا گیا ہے، ایران کی اقتصادی رگ یہودی سرمایہ دار کے ہاتھ میں ہے۔ یہودی اپنے اقتصادی نفوذ کے ذریعہ درپردہ سیاسی اغراض کی خدمت بھی کر رہے ہیں اور نشر و اشاعت کا بڑا مؤثر ذریعہ ان کے تصرف میں ہے۔ فری میسن کا بڑا مضبوط مرکز ایران میں کام کر رہا ہے اور مختلف راستوں سے ایرانی سیاسیات پر اثر انداز ہو رہا ہے یہی وجہ ہے کہ تمام اسلامی ممالک میں سے صرف دو ملک ایسے ہیں جنہوں نے اسرائیل کو تسلیم کیا ہے۔ ایک ترکی اور دوسرا ایران۔ ترکی صیہونی زعماء اور مفکرین کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ انہوں نے ترکی میں اسلامی تہذیب پر ضربِ کاری لگانے کے بعد اب ایران پر اپنی نگاہیں مرکوز کر رکھی ہیں۔ ایران کا بہائی فرقہ (جو چند سال پیشتر خلافِ قانون قرار دے دیا گیا تھا) یہودیوں کا آلہ کار بنا ہُوا ہے اور اخبارات و رسائل میں اس کا زہر بلا خوف مسلسل سرایت کرتا جا رہا ہے۔ رہے ایران کے کمیونسٹ، تو وہ ماسکو کے اشارے پر ناچ رہے ہیں۔

۵- ایران کے علماء باہمی اختلافات سے پاک ہیں۔ پچھلے پانچ سالوں سے انہوں نے عصری تقاضوں کے پیش نظر اپنے کام میں معتدبہ تبدیلیاں کر لی ہیں۔ ان کی زیادہ تر توجہ اب مذہب کے کلامی مسائل اور فروعی اختلافات کے بجائے ملّتِ اسلامیہ کی اصلاح پر مرکوز ہے۔ انہوں نے اپنے تمام اداروں کو ایک منظم تحریک کی شکل دے رکھی ہے قُم ان کا سب سے بڑا مرکز ہے جہاں ان کے مذہبی پیشوا رہتے ہیں۔ قُم میں ایک بہت بڑا تعلیمی ادارہ اور ایک اشاعتی مرکز قائم ہے تعلیمی ادارہ (الجامعۃ الاسلامیہ)

ہیں ۶ ہزار کے قریب طلبہ زیر تربیت ہیں۔ ان کے اشاعتی مرکز نے پچھلے ۵ سال میں اسلام کے سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی نظام پر مسلسل لٹریچر شائع کیا ہے۔ اس کے تحت ایک مضبوط دارالترجمہ کام کر رہا ہے جو اردو، عربی اور انگریزی زبانوں سے اسلامی لٹریچر کو فارسی میں منتقل کر رہا ہے۔ اس ادارہ سے جہاں ایک طرف اسلام کے نظام حیات پر مختلف کتابیں شائع ہوتی ہیں وہاں ایران کے موجودہ حالات پر بھی بھرپور تنقید کی گئی ہے اور حکمران طبقے کی بدکرداریں، یہودیوں کی ریشہ دوانیوں اور استعماری سازشوں کو بے خوف و خطر بے نقاب کیا گیا ہے۔ ایران کے حکمرانوں کی نگاہ میں یہ مذہبی تحریک اور اس کا روز افزوں پھیلاؤ بُری طرح کھٹک رہا ہے اور وہ اسے ختم کرنے کے لیے بہانے ڈھونڈ رہے ہیں۔

تازہ واقعات | اس پس منظر کے بعد اب اس خونیں ڈرامہ کی تفصیل سنیے جو ایک سال سے ایران میں کھیلا جا رہا ہے:

اس ڈرامے کی ابتدا پچھلے سال ۸ جمادی الاوّل ۱۳۸۲ھ کو ہوئی جبکہ ایرانی کابینہ نے وزیراعظم اسداللہ علم کی صدارت میں قانون انتخاب کے ترمیمی بل پر مُہرِ تائید ثبت کی اور اس کی رُو سے آئندہ کے لیے یہ طے کر دیا گیا کہ:

۱۔ ایرانی عدالتوں اور دوسرے اداروں میں قرآن کریم کے بجائے "آسمانی کتاب" کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

۲۔ عورتیں انتخابات میں حصہ لے سکیں گی۔ ووٹر کی حیثیت سے بھی اور امیدوار کی حیثیت سے بھی

۳۔ غیر مسلم کو بھی ووٹ دینے اور امیدوار بن کر کھڑا ہونے کا حق ہوگا (مخلوط انتخاب کے اصول کے تحت)۔

اس بل کی منظوری پر پورے ملک میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ملک بھر کے علماء اور دانشوروں اور سیاسی و اجتماعی حلقوں نے اس کی شدید مخالفت کی، اس کے مضمرات و نتائج کے خطرے سے قوم کو آگاہ کیا، اور اسے خلافِ اسلام اور منافیٔ جمہوریت قرار دیا۔ علماء اور دانشوروں کے بیان کے مطابق یہ بل یہودی اور سامراجی عناصر کا راستہ ہموار کرنے کے لیے نافذ کیا گیا ہے۔ کیونکہ غیر مسلموں کو (جو صرف چند

یہودیوں سے عبارت ہیں، مخلوط انتخاب کے اصول کے تحت انتخاب میں حصہ لینے کا حق دینے کے معنی یہ ہیں کہ آئندہ انتخابات میں یہودی اور ان کے ہمسفر اپنی اقتصادی طاقت اور اپنے وسیع ذرائع نشرواشاعت کے بل پر بڑی کامیابیاں حاصل کر سکتے ہیں۔

ملک گیر ہنگاموں کے جواب میں وزیر اعظم اسد اللہ علم نے ترمیمی بل کا عجیب و غریب فلسفہ بیان کرنا شروع کر دیا جس سے یہ ہنگامے فرو ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئے۔ اور جب حکومت کے پاس دلیل کی کوئی طاقت نہ رہی تو اس نے تشدد اور تہدید کا راستہ اختیار کر لیا۔ علماء پر دست اندازی شروع کر دی جو ان ہنگاموں میں پیش پیش تھے، اور ان کو طرح طرح کی دھمکیوں سے مرعوب کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس قانون کے خلاف لٹریچر شائع کرنے یا بیان جاری کرنے پر پابندی لگا دی گئی۔ اور جن لوگوں کے پاس ایسا کوئی لٹریچر تھا انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ بیرونی دنیا کو اس کشمکش سے بے خبر رکھنے کے لیے اخبارات کو اس کے بارے میں خبریں شائع کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ مگر ان تمام ہتھکنڈوں اور تدبیروں سے عوام کی مخالفت میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ عوام کی شدید مخالفت اور علماء اور زعماء کی متفقہ تنقید کے سامنے وزیر اعظم کو بالآخر گھٹنے ٹیکنے پڑے اور ۳ رجب ۱۳۸۲ھ کو، یعنی بل کی منظوری کے صرف دو ماہ بعد، ایک پریس کانفرنس میں یہ اعلان کرنا پڑا کہ "ریاست کی مجلس اعلیٰ نے سولہویں ترمیمی بل پر، جو ۸ جمادی الاول کو کابینہ کی طرف سے منظور کیا گیا تھا، عملدرآمد روک دیا ہے"۔

واضح رہے کہ قانون انتخاب کا یہ ترمیمی بل ایران کی کابینہ نے منظور کیا تھا۔ ایران کا ایوانِ زیریں (اسمبلی) اور ایوان بالا (سینٹ) دونوں ایک عرصہ سے معطل ہیں۔ اور ایرانی دستور کی رو سے اس نوعیت کی کوئی ترمیم ایوانِ زیریں اور ایوان بالا ہی کر سکتا ہے۔ کابینہ کا یہ تصرف جمہوریت اور ایران کے قانون اساسی کے صریح منافی تھا۔

شاہ کی مداخلت | وزیر اعظم کی پسپائی کے بعد ایران کا سربراہ مملکت اس میدان میں نکلتا ہے اور افسوس ہے کہ اس انتہائی سنجیدہ مسئلے میں قانونی راستہ اختیار کرنے کے بجائے اسی نوعیت کے ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے جو دنیا کے اندر استعماری طاقتیں غلام ممالک کے حق میں استعمال کرتی رہی ہیں۔

شاہ نے شعبان ۱۳۸۲ھ کے اوائل میں طہران میں ایک "کل ایران کسان کانفرنس" منعقد کی اور اس کے افتتاحی اجلاس میں ۱۵ ہزار مزدوروں اور کسانوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ "میں سربراہِ مملکت اور قائدِ افواج کی حیثیت سے چھ باتوں پر ایرانی عوام سے استصواب کرانا چاہتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ ایرانی عوام ان چھ باتوں میں میرا ساتھ دیں گے"۔ ان چھ باتوں میں سے ایک وہ ترمیمی بل بھی تھا جسے کابینہ نے منظور کیا تھا اور وزیرِ اعظم نے عوام کی شدید مخالفت کے پیشِ نظر واپس لے لیا تھا۔ باقی پانچ امور زرعی اور صنعتی اصلاحات سے متعلق تھے اور ان میں کسانوں اور مزدوروں کو زمینوں اور کارخانوں کی آمدنی میں برابر کا حصہ دار بنانے کا وعدہ تھا اور اوقاف کی زمینوں کو قومی ملکیت میں لینے کا اعلان تھا۔ انتخاب کے ترمیمی بل میں مزید وضاحت کر دی گئی کہ عورت کو مرد کے مساوی حقوق دیئے جائیں گے (وراثت وغیرہ میں)۔ شاہ نے استصواب کے لیے ۲۹ شعبان ۱۳۸۲ھ کی تاریخ مقرر کر دی اور استصواب کے اعلان اور انعقاد کے درمیان نہایت محدود وقفہ رکھا گیا۔ اس وقفہ میں ایرانی عوام اور حکمرانوں کی طرف سے جو ردِ عمل ہوا ہے اُس کی مختصر رُوداد یہ ہے:

ردِ عمل ملک بھر میں حسبِ سابق ہنگامے برپا ہو گئے۔ دارالحکومت طہران میں زبردست احتجاجی جلوس نکلا جس میں لاکھوں کی تعداد میں مردوں، عورتوں اور طلبہ نے شرکت کی اور شاہ سے مطالبہ کیا کہ اس خلافِ قانون فیصلے کو منسوخ کیا جائے۔ عوام الناس نے احتجاج کو کامیاب بنانے کے لیے علماء کا پورا ساتھ دیا۔ دوکانداروں اور تعلیمی اداروں نے ہڑتال کی اور پورا شہر طہران کی سڑکوں پر نکل آیا۔ ملک کے باہر بھی ایرانی طلبہ اور تاجروں نے احتجاج کیا۔ واشنگٹن میں اور جرمنی کے متعدد شہروں میں ایرانی طلبہ نے مظاہرے کیے جن کی خبریں اخبارات اور ریڈیو سے نشر ہوئیں۔ واشنگٹن میں ایرانی طلبہ نے ایران کے سفارت خانہ میں مظاہرہ کیا اور اپنے سفیر سے مطالبہ کیا کہ اُن کے احتجاج کو شاہ تک پہنچایا جائے۔

ایران، عراق، لبنان اور دوسرے ممالک سے شاہ کو اور طہران کے ذمہ دار حلقوں کو ہزاروں احتجاجی برقیے، محضر نامے اور خطوط بھیجے گئے جن میں شاہ کی میکیاویلی سیاست پر اظہارِ نفرت کیا گیا۔

ظلم و ستم ایران کے مذہبی مرکز قم میں بھی زبردست مظاہرہ ہوا جس میں ہر طبقہ و خیال کے لوگوں نے

شرکت کی اور استعمار پسندوں، یہودیوں اور کمیونسٹوں سے ملک کو نجات دلانے کا مطالبہ کیا۔ اس جلوس میں دس ہزار افراد نے منظم طور پر شرکت کی۔ مظاہرین نے ہاتھوں میں قرآن کریم اٹھا رکھا تھا اور نعرہ لگا رہے تھے کہ "ہم قرآن کے تابع ہیں۔ یہ کتاب جو فیصلہ کرے وہ برحق ہے" پولیس اور امن کے دستوں نے مظاہرین کو منتشر کرنے کے لیے تشدد کا استعمال کیا اور لوگوں پر لاٹھیاں برسائیں۔ قم کے مدرسہ فیضیہ میں گھس کر علماء اور طلبہ پر ہلہ بول دیا اور اُن کا ساز و سامان لوٹ لیا اور کثیر تعداد کو جیلوں میں بند کر دیا۔

طہران یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ نے احتجاجی جلوس نکالے۔ پولیس نے طلبہ کے جلوس پر شدید لاٹھی چارج کیا جس سے سینکڑوں افراد زخمی اور بے ہوش ہو گئے۔ حکومت کی اس کارروائی پر ایران کے تمام حلقوں میں سخت نفرت اور مذمت کا اظہار کیا گیا۔ زخمی طلبہ کو پہلے طہران کے ہسپتال میں داخل کیا گیا، مگر زائرین کی کثرت کی وجہ سے زخمیوں کو ہسپتال سے قبل از وقت ڈسچارج کر دیا گیا۔

تبریز میں عوام نے ریڈیو اسٹیشن کے سامنے مظاہرہ کیا اور صبح سے لے کر شام تک مظاہرین اور پولیس کے درمیان مقابلہ ہوتا رہا۔ مقابلہ میں کچھ لوگ مارے گئے اور بکثرت زخمی ہوئے۔ جو بچ گئے انہیں گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیا گیا۔

طہران کی "قزل قلعہ" جیل اور "قصر قجر" جیل مظاہرہ اور احتجاج کرنے والوں سے بھری پڑی ہیں۔ ان پر الزام یہ ہے کہ انہوں نے شاہ کی "مقدس نیت" کی توہین کی ہے۔

قُم میں سیدہ معصومہ کے روضہ کے متولی ابوالفضل تولیت کو گرفتار کر لیا گیا کیونکہ انہوں نے شاہ کے حکم کی تعمیل نہیں کی تھی۔ شاہ جب قُم کے دورہ پر جانے لگے تو ابوالفضل تولیت کو حکم بھیجا گیا تھا کہ وہ شاہ کا استقبال کریں اور پورے مذہبی مراسم کے ساتھ اُن کا خیر مقدم کریں۔ چونکہ شاہ کا یہ دورہ استصواب کے سلسلہ میں تھا اس لیے متولی مذکور نے احتجاجاً استقبال کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی جرم کی پاداش میں وہ آج تک نذرِ زنداں ہیں۔

علماء کی مخالفت: ایران کے تمام ممتاز علماء نے عوام کو ریفرنڈم میں حصہ لینے سے روک دیا۔ ان میں ایران کے مذہبی مرکز قُم کے پیشوا سید کاظم شریعت مداری، ایران کے ایک اور نمایاں رہنما

آیت اللہ ابوالقاسم خوئی اور حسن طباطبائی (آیت اللہ بروجردی مرحوم کے صاحبزادے) اور آیت اللہ خمینی ہیں۔ شیراز کے ۲۴ علماء کا مشترکہ فتویٰ بھی استصواب کی تحریم پر صادر ہوا۔ ان فتاویٰ میں استصواب کے مضمرات اور پس پردہ اغراض پر روشنی ڈالی گئی۔

علامہ کاظم شریعت مداری نے اپنے فتویٰ میں وضاحت کی کہ "ایسے بنیادی معاملات میں عوامی نمائندوں کے بغیر استصواب کا راستہ اختیار کر لینا انتہائی خطرناک ہے۔ کیونکہ اگر یہ دروازہ ایک مرتبہ کھول دیا گیا تو کل اس امر پر استصواب ہوگا کہ ایران کا سرکاری دین اسلام کے علاوہ کوئی اور ہونا چاہیے! ملک کے اندر ایسے منافق موجود ہیں جو بلا تأمل یہ رائے دیں گے کہ اس ملک کے لیے اسلام موزوں نہیں ہے بلکہ یہودیت یا کمیونزم موزوں ہے۔ نیز یہ استصواب ملک کے قانونِ اساسی کے منافی ہے کیونکہ قانونِ اساسی میں استصواب کا طریقہ اختیار کرنے کا ذکر نہیں ہے۔ اور ستم یہ ہے کہ یہ استصواب خود قانونِ اساسی کے اندر ترمیم کرنے کے لیے کروایا جا رہا ہے۔ چند سال پیشتر ایک حکومت نے استصواب کا طریقہ تجویز کیا تھا مگر بعد کی تمام حکومتوں نے اسے موردِ تنقید ٹھیرایا اور اُس حکومت کی بداعمالیوں میں اسے سرِفہرست شمار کیا۔ نیز ایرانی قوم اپنی رائے دینے کے لیے پوری طرح آزاد نہیں ہے۔ اسمبلی اور سینیٹ معطل ہیں۔ پروپیگنڈا کے تمام وسائل حکومت کے ہاتھ میں ہیں یا ان لوگوں کے ہاتھ میں ہیں جو ایرانی عوام کے نظریات کے دشمن ہیں۔ اخبارات پر حکومت کا سنسرشپ ہے۔ عوام کے رہنما جس بات کو پھیلانا چاہتے ہیں اُسے روک دیا جاتا ہے۔ اور استصواب کے لیے وقفہ بھی بہت محدود رکھا گیا ہے۔" علامہ موصوف نے فتویٰ میں شاہ کو توجہ دلائی کہ اگر آپ اپنے زیرِ استصواب مسائل کے بارے میں عوامی رائے معلوم کرنا ہی چاہتے ہیں تو ان مظاہروں اور جلوسوں سے معلوم کر لیں جو طہران، تبریز، شیراز اور دوسرے شہروں میں ہو رہے ہیں۔ علامہ موصوف نے حکومت کے تشدد اور سخت گیری پر بھی شدید احتجاج کیا۔

امام خمینی اور آیت اللہ حسن طباطبائی نے بھی اپنے فتاویٰ میں واضح کر دیا کہ ان مسائل

میں عوام کی رائے دریافت کرنا جن کا صاف حکم شریعت اسلامی میں موجود ہے، حرام ہے۔ کسی مسلمان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان مسائل میں رائے دریافت کرے یا رائے دے جن کا فیصلہ خدا اور رسول کر چکے ہوں۔

حکومت کی جوابی کارروائیاں | حکومت نے عوامی مظاہروں کے بالمقابل مظاہروں کا انتظام کیا۔ ایران کی فاحشہ عورتوں اور ترقی پسند بیگمات کے ہاتھوں میں پلے کارڈ دے کر طہران کی سڑکوں پر شاہ کے حق میں نعرے لگوائے۔ اور پھر ان ناکام مظاہروں کی تصویریں اور من گھڑت رودادیں شائع کر کے ایرانی عوام کو اور بیرونی دنیا کو دھوکہ دینے کی کوشش کی۔

شاہ اور اس کی موجودہ حکومت عوامی مجالس کو معطل کر کے مذکورہ مسائل پر استصواب سے جن خواہشات کو پورا کرنا چاہتی تھی وہ اگرچہ ڈھکی چھپی نہیں تھیں لیکن خود ان کے اپنے متعدد بیانات سے مزید ان کی وضاحت ہو گئی۔ "کل ایران کسان کانفرنس" میں، جس کے افتتاحی اجلاس میں شاہ نے استصواب کا اعلان کیا تھا۔ ایران کے وزیر زراعت ارسنجانی نے ۱۵ ہزار مزدوروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"ہم مزدوروں اور کسانوں کے حالات بہتر بنانا چاہتے ہیں۔ ہم فساد انگیز قدامت پرستی کا قلع قمع کرنا چاہتے ہیں۔ عورت کو "سوسائٹی" میں مناسب مقام دینا چاہتے ہیں۔ . . ."

اس کے بعد وزیر صاحب نے ایک با پردہ عورت کی طرف اشارہ کر کے کہا: "ہم اپنے معاشرے سے پردے کے جھگڑے کو ختم کرنا چاہتے ہیں . . . . کیونکہ پردہ عورت کی سوشل سرگرمیوں میں حائل ہو رہا ہے" . . . . وزیر صاحب نے کسانوں اور مزدوروں سے پوچھا کہ کیا آپ لوگ ہمارا ساتھ دیں گے۔ وزیر کے اعلان پر پورے مجمع میں سے ایک آواز بھی نہ بلند ہوئی۔ صرف اسٹیج پر بیٹھے ہوئے چند خوشامدیوں نے اپنے ہاتھوں سے تائید کا اشارہ کیا۔

وزیر زراعت نے ایک اور موقع پر بیان دیتے ہوئے تصریح کی کہ "ملک کا قانون اساسی نصف صدی قبل ایرانی عوام کے خیالات و افکار کے ہم آہنگ تھا لیکن اب اس میں ترمیم ضروری ہو گئی ہے"۔ اس سے صاف واضح ہے کہ استصواب کا مقصد ملک کے قانونِ اساسی میں تبدیلی ہے۔ نصف صدی پرانا قانون اسلام کو ایران کا سرکاری مذہب قرار دیتا ہے۔ ملکیت اور وراثت اور دوسرے عائلی مسائل میں اسلام کی طرف رجوع کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ یہودیوں اور کمیونسٹوں کے تخریب پسندانہ نظریات کا مخالف ہے۔ خود شاہی خاندان کو بعض حدود کا پابند کرتا ہے۔ مرد و زن کی مساوات کی آڑ میں عریانی کی حمایت نہیں کرتا۔ لیکن اب ان تمام چیزوں سے نجات پانے کے لیے نصف صدی قبل کے قانونِ اساسی سے نجات پانا ضروری ہو گیا ہے۔ یہ غرض چونکہ عوامی مجالس کی موجودگی میں حاصل نہیں ہو سکتی لہٰذا مجالس کو معطل کر کے "ریفرنڈم" کا ذریعہ اختیار کیا گیا ہے۔ اور یہ ریفرنڈم جلدی جلدی ایسی حالت میں کرایا جا رہا ہے کہ عوامی رہنماؤں کو اظہار رائے اور نشر و اشاعت کے تمام ذرائع سے زبردستی محروم کر دیا گیا ہے۔

استصواب کس شان سے ہوا حکومت نے ــــ اور صحیح الفاظ میں شاہ اور اس کے محافظ دستوں نے ــــ عوام کے پُرزور احتجاجات، ایران کے اربابِ فکر و نظر کی دندان شکن تنقیدات اور علماء کے فتاویٰ کے علی الرغم ۲۹ شعبان ۱۳۸۲ھ کو استصواب کا ڈھونگ رچایا لیکن استصواب کی تاریخ آنے سے قبل ملک کی یہ حالت تھی کہ ملک بھر کے اندر مظاہرے ہو رہے تھے اور ہڑتالیں ہو رہی تھیں اور حکومت پوری ڈھٹائی کے ساتھ لوگوں پر گولیاں برسا رہی تھی۔ گرم گرم ہسپتالوں سے ان کے جسموں کو داغا جا رہا تھا اور بوڑھوں اور عورتوں کی کھوپڑیوں کی ہڈیوں سے خبر لی جا رہی تھی۔ ۲۹ شعبان ۱۳۸۲ھ کو علماء اور زعماء کی کثیر تعداد جیلوں میں تھی اور کسی دینی اور اصلاحی جماعت کا سربراہ اور کوئی سوشل ورکر باہر نہ تھا۔ ممتاز مذہبی پیشواؤں کے گھروں پر پہرہ تھا۔ طہران کے عالم آیت اللہ اصبہانی نے استصواب کی مخالفت میں علیٰ

استصواب سے ایک روز قبل ایک بہت بڑے جلوس کی قیادت کرنا چاہی، جو طہران کے تمام طبقوں کا نمائندہ جلوس تھا اور جس کی اگلی صفوں میں علماء، خطباء اور تجار اور وکلاء تھے مگر پولیس نے علامہ موصوف کو جلوس کی قیادت سے روک دیا اور تتر بتر کرنے کے لیے جلوس پر فائرنگ کی۔ اور جب مظاہرین نے اردگرد کے گھروں میں پناہ لی تو پولیس نے گھروں میں گھس کر ان کو گرفتار کیا اور علامہ آیت اللہ بہبہانی کے حرم میں داخل ہو کر اُن کی عزت پر حملہ کیا۔ اسی طرح پولیس نے علامہ خونساری کو مسجد میں نماز ادا کرنے سے منع کر دیا اور اُن کی شدید توہین کی۔

استصواب میں ایران کے ۲ کروڑ باشندوں میں سے صرف چند لاکھ افراد نے حصہ لیا ہے جن میں اکثریت حکومت کے ملازمین کی ہے۔ ملازمین کو باقاعدہ سرکاری طور پر استصواب میں رائے دینے کا حکم دیا گیا اور شاہ کی "مقدس نیت" کی تائید کرنے کی تلقین کی گئی۔ ان کے علاوہ یہودیوں اور بہائیوں نے "زرِ کثیر" صرف کر کے ایسے حامی پیدا کر لیے جو دین و اخلاق سے عاری تھے استصواب کے روز پورے ملک پر غم و غصہ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اور استصواب کے بعد بھی رمضان اور شوال میں پیہم اس ڈھونگ سے اظہارِ براءت کیا جاتا رہا اور حکومت اور قوم کے درمیان مختلف تقریبوں میں بحث و کشمکش جاری رہی۔

ظلم کی انتہا ۲۵ شوال ۱۳۸۲ھ کو ایران کی سرزمین پر ایک اور دردناک حادثہ رونما ہوا۔ قُم میں، جو ایران کی مذہبی قیادت کا مرکز ہے، ۲۵ شوال کو امام جعفر صادقؓ کا یومِ وفات تھا۔ اس روز حسبِ دستور قُم کی اسلامی یونیورسٹی میں ایک بہت بڑا اجتماع ہوا جس میں قُم اور اطراف و نواح سے ۲۰ ہزار مندوبین نے شرکت کی اور ایران کے ممتاز علماء اور خطباء جمع ہوئے۔ حکومت قُم کے مذہبی مرکز سے پہلے ہی خار کھائے بیٹھی تھی اور حیلوں اور بہانوں سے اس کو نیست و نابود کرنا چاہتی تھی۔ امام جعفر صادقؓ کے یومِ وفات پر ایک عظیم اجتماع کا انعقاد اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ چنانچہ جب یونیورسٹی کے کشادہ صحن میں اجتماع کا آغاز ہوا تو یکایک ۳۵ ٹرک جن میں ڈیڑھ ہزار کے قریب سفید پوش فوجی تھے اجتماع گاہ میں آکر

اُترے۔ یہ ایرانی فوج کے ان دستوں سے تعلق رکھتے تھے جنہیں "کمانڈو" کہا جاتا ہے اور جن میں وحشت و درندگی کوٹ کوٹ کر بھری جاتی ہے۔ اجتماع کی کارروائی کا آغاز ہی ہوا تھا کہ ان فوجیوں نے "شاہ زندہ باد" اور "شاہی خاندان" زندہ باد اور "سوشل اصلاحات" زندہ باد" کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ مقررین کے لیے اپنی تقریروں کو جاری رکھنا دشوار ہو گیا۔ ایک دو تقریریں ہی ہوئیں کہ ان فوجیوں نے حاضرین پر ہلّہ بول دیا اور وہ طوفانِ بدتمیزی اور ظلم و تشدد برپا کیا کہ اسے سُن کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اسلامی یونیورسٹی کے کم عمر طلبہ، جو اس ہنگامۂ دار و گیر سے خوف زدہ ہو کر مکانوں کی چھتوں پر چڑھ گئے تھے ان سفاکوں نے انہیں اٹھا اٹھا کر چھتوں سے نیچے پھینکا۔ اُن میں سے اکثر اسی وقت جاں بحق ہو گئے اور کچھ زخموں کی تاب نہ لا کر دو تین روز کے بعد مر گئے۔ عمارتوں کے شیشے اور کمروں کے دروازے توڑ ڈالے۔ طلبہ اور اساتذہ کا تمام سازو سامان نذرِ آتش کر دیا۔ ان کی قیمتی اشیاء کو لوٹ لیا۔ قرآن مجید اور مذہبی کتب کی توہین کی۔ لائبریریوں کی کتابوں کو (جو نہایت نایاب ذخیروں پر مشتمل تھیں) جلا کر خاکستر کر دیا۔ اور دو گھنٹے تک ایسا غلغلۂ رستاخیز برپا کیا کہ یونیورسٹی کا صحن اور دیواریں انسانی خون سے لالہ زار بن گئیں۔

اسی روز تبریز میں بھی یہی ڈرامہ کھیلا گیا۔ امام جعفر صادقؓ کے یومِ وفات کی تقریب میں جو جلسہ ہو رہا تھا پولیس اور تحفظِ امنِ عامہ کے دستوں نے اس پر حملہ کر دیا اور بے تحاشا فائرنگ کی اور قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ یہ وہی تبریز ہے جس کی وطن دوستی کا اعتراف خود شاہ کو ہے۔ شاہ نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ "تبریز ایران کا نہایت وفادار علاقہ ہے۔ اہلِ تبریز ہی ہیں جنہوں نے اس پورے علاقہ سے کمیونسٹوں کا خاتمہ کیا ہے اور کمیونسٹوں کے سرغنے پیشہ وری کی تحریک کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکا ہے"۔

مشہد میں بھی، جہاں امام رضاؒ کا روضہ ہے یہی حادثۂ فاجعہ پیش آیا۔ پولیس نے

وہاں کی تمام نمایاں شخصیتوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں بھر دیا اور انہیں دھمکیاں دی گئیں کہ اگر وہ "مرضئی شاہ" کے خلاف کوئی اقدام کریں گے تو اس ملک میں انہیں کوئی پناہ نہیں مل سکے گی۔

ان حوادث پر تمام ملک میں سوگ منایا گیا۔ ماتمی محفلیں منعقد ہوئیں۔ ہڑتالیں ہوئیں۔ حتیٰ کہ ٹیکسی ڈرائیوروں نے بھی ملک گیر ہڑتال کی۔ ملک کے کونے کونے سے شاہ کو مذمت کے تار بھیجے گئے۔ عزا اور فاتحہ کی مجلسوں میں شہداء کے لیے دعائیں کی گئیں۔ اور پورا ملک سراپا افسوس و ماتم بن گیا۔ مذفول کی فوجی چھاؤنی میں فوج کے آفیسروں نے اس واقعہ پر اظہار غم کیا۔ جس کی پاداش میں ۲۶ فوجی افسروں کا کورٹ مارشل کیا گیا اور انہیں موت کی سزا دی گئی۔

فوج کے افسروں کے ساتھ یہ سلوک فوج کے اندر مزید اضطراب و انتشار پیدا کرنے کا موجب ہوا ہے۔ اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ فوجی آفیسرز کی طرف سے متواتر ایسے گمنام پمفلٹ شائع ہو رہے ہیں جن میں شاہ کے اقدامات اور قم و تبریز کے حوادث پر احتجاج کیا گیا ہے۔ قرآن کریم کی بے حرمتی اور مذہبی کتابوں کو نذر آتش کر دینے پر سخت غم و غصہ کا اظہار کیا گیا ہے اور شاہ کے اقدامات کو خلافِ قانون قرار دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ملکی فوج کے اندر ایسے خیالات کا پرورش پانا ملک کی سالمیت کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے۔

حکومتِ ایران کے ان مظالم پر نہ صرف ایران کے ہر طبقہ و خیال کے لوگوں نے انتہائی غم و افسوس کا اظہار کیا ہے اور اس کے نتائج کو ایران کے لیے انتہائی مضر قرار دیا ہے بلکہ عراق کے عوام نے بھی اس پر شدید احتجاج کیا ہے۔ عراق سے تمام شیعہ اور سُنی علماء نے حکومتِ ایران کو احتجاجی محضر نامے بھیجے ہیں، دنیا کے تمام مسلم اور غیر مسلم ممالک کے سربراہوں کو ایرانی حکومت کے مظالم پر توجہ دلاتی ہے اور انسانیت کے نام پر ایران سے دخل دینے کا مطالبہ کیا ہے بس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ ایرانی علماء کی اکثریت جیلوں میں ہے اور جو باہر ہیں انہیں عوام الناس سے بالکل منقطع کر دیا گیا ہے۔ لازمی فوجی تربیت کا آرڈی ننس جاری کر کے ان تمام طلبہ کو فوج کے حوالے کر دیا گیا ہے جو ایران کے مذہبی مدارس میں زیرِ تعلیم تھے۔ مذہبی لٹریچر کی اشاعت

ممنوع قرار دے دی گئی ہے اور وہ تمام اخبارات و رسائل بند کر دیئے گئے ہیں جو مذہبی حلقوں کی طرف سے نکلتے تھے یا مذہب کی حمایت کرتے تھے۔ زرعی اصلاحات کے بہانے سے علماء کی ذاتی ملکیتوں کو چھینا جا رہا ہے اور اُن کے بچوں اور عورتوں کو طرح طرح سے خوف زدہ کیا جا رہا ہے۔ ایران کے تمام مذہبی ادارے اس وقت معطل ہیں۔ مساجد میں اذان و جماعت کا انتظام ختم ہو چکا ہے۔ شر پسند اور اسلام دشمن عناصر اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر ایران سے مذہب کے اثر و نفوذ کو کلیتہً ختم کرنے کے لیے سرگرم ہیں۔

یہ ہیں وہ دلگداز حالات جن سے ہمارا ہمسایہ اسلامی ملک ایران اس وقت گزر رہا ہے۔

مطبوعات

سرورِ کونین | مولانا عبدالقیوم ندوی صاحب ۔ ناشر: ایم ثناءاللہ خاں اینڈ سنز ۲۶۔ ریلوے روڈ لاہور۔ قیمت دو روپے ۱۲ آنہ پیسے ۔ صفحات ۱۴۴۔

زیر تبصرہ کتاب حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح حیات ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے بڑی سلاست کے ساتھ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کے مختلف پہلوؤں کو قلمبند کیا ہے مصنف کا قلم بڑا محتاط ہے اور اس نے حدودِ ادب کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے

یہ کتاب یوں تو ہر طبقہ کے لیے مفید ہے لیکن ہم نوجوانوں کو اس کے مطالعہ کی خاص طور پر سفارش کرتے ہیں۔

صنعت اکسیر | مرتبہ حکیم محمد یوسف حسن۔ قیمت تین روپے۔ شائع کردہ: اشرف اکیڈیمی پوسٹ بکس نمبر ۱۰۱ سلانوالی پور۔

کشتہ سازی، فنِ دواسازی اور معالجات کا ایک اہم شعبہ ہے مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں اس شعبہ کو کافی ترقی دی لیکن ان کے اضمحلال کے بعد اس پر زوال آنا شروع ہوگیا اس وقت اس چیز کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ ہم اپنے ملک کے اندر ایک ایسے نظام طب کو رواج دیں جو ہمارے ملک کے مزاج اور طبعی حالات سے مطابقت رکھتا ہو اور جس کے ساتھ ساتھ انگریزی ادویہ کی ناقابلِ برداشت گرانی سے ہمیں نجات دلا سکے۔

زیر تبصرہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک مفید کوشش ہے۔ جو حضرات اس فن سے دلچسپی رکھتے ہیں انہیں تجربہ کے ذریعہ اس کی افادیت کا اندازہ لگانا چاہیے۔